خاطر غزنوی

جناب راشد اشرف صاحب
کے نام
یادرِ احسان
داماد
خاطر غزنوی

ایک کمرہ

(ایک کمرے کا خاکہ، ایک خاکوں بھرا خاکہ)

خاطر غزنوی

ناشر

سنڈیکیٹ آف رائٹرز (پاکستان) رجسٹرڈ

۳۱، گلی نمبر ۱۷، گل بہار، پشاور

ضابطہ

طبع — باراول اکتوبر ۲۰۰۱ء

ناشر — سینڈیکیٹ آف رائٹرز [رجسٹرڈ]
۳۱ گلی ۱۷، گل بہار، پشاور

سرورق — مبشر

کمپوزیشن — مسود سمیع، مبشر، محمد الیاس

مطبع — منظور عام پریس، پشاور

قیمت — ۱۰۰ روپے

دیوارودر

درِ خانہ وا کرو

ایک کمرہ

ایک جدید کمرہ

ادبی انجمنیں اور صوبہ سرحد

صوبہ سرحد کی نئی نسل اور شاعری

جشنِ مہتاب

بزمِ سخن اور دائرۂ ادبیہ کے نام

جو سرحد میں ادبی دانشگاہوں کا درجہ رکھتی تھیں

درِ میخانہ وا کرو

ایک کمرہ ۔ ۔ ۔ محض ایک کمرہ نہیں' یہ ابتداء ہے' عروج ہے' منبع ہے' سرچشمہ ہے' ادب و شعر کا' تہذیب و تمدن کا' ثقافت کا ۔ سرحد میں اردو زبان و ادب کا ۔ اور پھر یہ کمرہ ایک تحریک بن جاتا ہے' ادبی تحریک' جو آج تک رواں دواں ہے ۔ اس وقت تک تین نسلوں نے اس تحریک کا جزو بن کر آگے بڑھنے کی سعی کی ہے ۔

شاید یہ سطور قاری کیلئے مبہم ہوں' تو اس ابہام کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ سائیں احمد علی' سید جگر کاظمی' قاضی محمد عمر قضا اور پھر کوچہ رسالدار میں مسگر کی دکان' قمر سرحدی کا ریستوران اور پھر جعفر علی جعفری سرحدی کا ٹھکانہ ۔ ۔ ۔ مرحوم اسلامیہ کلب ہال' کوچہ رسالدار میں بزمِ سخن کا ٹھیہ' شاہ ولی قتال میں دائرہ ادبیہ جہاں انجمن ترقی اردو (سرحد) نے جنم لیا ۔ محلّہ خداداد میں فارغ رضا کی دو نشست گاہیں' پہلی پیپل کے پڑوس میں اور دوسری اندر آغا نقی شاہ کی میدانی میں چھوٹے سے حوض کے پہلو میں واقع بیٹھک' پھر پشاور صدر کے کالی باڑی بازار میں اردو سبھا' کوچہ دالگراں میں اردو مرکز' یعنی شوکت واسطی کا حلقہ' ریڈیو پاکستان میں ن م راشد' حافظ سعید اور خاطر غزنوی کی ادبی مجلس' ریلوے انسٹی ٹیوٹ پشاور صدر میں سرکار زینی جارچوی اور پروفیسر نصیر احمد زار کا حلقہ اربابِ ذوق جو چلتا چلتا پشاور پریس کلب' سندباد ہوٹل سے ہوتا ہوا مرکزی اردو سائنس بورڈ کے ریڈنگ روم میں جا پہنچا ۔ پشاور یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر علی خان کا دولت کدہ ۔ پشتو اکیڈیمی میں مولانا عبدالقادر کے گرد حلقہ احباب' ٹیچر سٹوڈنٹس سنٹر میں نوخیز اہل قلم

ایک کمرہ

ایک کمرے کا خاکہ ، ایک خاکوں بھرا خاکہ

کا ادبی فورم، خیبر کیفی میں ہوٹل میں زیرہ ڈالنے والوں کا جمگھٹا، محلہ دنی چند میں بیٹھک سے باہر تک اہل ذوق کا ہجوم، ایجرٹن پارک میں پانی چھوڑے جانے سے سانپوں کی یلغار اور بارود کے دھماکوں کے باوجود اردو سے محبت کرنے والوں کا اجتماع، فارورڈ سکول آسامائی میں مختلف ادبی انجمنوں کا اکٹھ، گلبہار کی گلی نمبر سولہ میں ناز سرحدی کے گھر کا ایک مستطیل کمرہ، اسی گلبہار کی گلی نمبر سترہ میں سنڈیکیٹ آف رائٹرز کا ہر مہینے کے پہلے جمعے کو جلسہ۔

یہ وہ مقدس مقامات تھے اور ہیں جہاں شعروادب پروان چڑھے اور اب بھی پروان چڑھائے جا رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہم رہیں یا نہ رہیں جاری رہے گا

یہ وہ مے خانے تھے اور ہیں جن کے دروازے سب کے لئے کھلے رہے ہیں سب رندان ادب یہاں شعر کی شراب اور نثر کی گزک سے لذت یاب ہوتے رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب اسی ادبی تحریک کی داستان ہے، روداد ہے، ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں چہرے ہیں عظیم لوگوں کے جنہوں نے شعروادب کے لئے اپنی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ ایک خاکہ ہے ادب کا، شعر کا، مقالہ وافسانے کا اور خود یہ کمرہ عظیم شخصیتوں کے خاکوں سے بھرا ہوا ہے۔

یہ صوبہ سرحد میں ادب کی تاریخ ہے، شعر کا تاریخی جائزہ ہے۔

دیکھئے سرحد میں ادب کی رفتار کو واضح کرنے میں ہمیں کس حد تک کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

خاطر غزنوی

گل بہار پشاور

یکم اکتوبر 2001ء

سرورق: دائیں سے بائیں
احمد فراز، سعادت حسن منٹو، مجید شاہد، شوکت واسطی، فارغ رضا، ضیا جعفری، احمد ندیم قاسمی، سید جگر کاظمی، عبدالودود قمر، خاطر غزنوی، مصطفیٰ علی ہمدانی، اجمل خٹک، امیر حمزہ شنواری، قتیل شفائی، ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس، حسرت موہانی، دوست محمد کامل، ن، م، راشد، زیڈ اے بخاری، یوسف رجا چشتی، محسن احسان، قاضی محمد عمر قضا، مختار صدیقی

جس کمرے کا میں ذکر کرنے لگا ہوں دیکھنے میں بڑا غیر اہم سا کمرہ ہے اس کی دیواریں کچی ہیں اور اس پر چونے کی تہوں نے ایک اور دیوار کھڑی کردی ہے گلی کی جانب تین در دو بتے اور ایک ننھا سا دروازہ ہے جس میں سے سر جھکا کر گزرنا پڑتا ہے ورنہ یہ مزاج پوچھ بیٹھتا ہے۔ نیچی سی چھت ہے جس کے وسط میں بجلی کے تار کے سرے پر ایک بلب لٹک رہا ہے اس بلب پر ایک بھڑ عاشق ہے جسے ہر گرمی میں ہزاروں مرتبہ مار دیا گیا لیکن وہ ہر بار زندہ ہو کر اس بلب کے گرد منڈلاتی رہتی ہے اور خدا جانے آئندہ وہ کتنی ہی گرمیاں یونہی منڈلاتی رہے۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کوئی پانچ فٹ اونچی ایک چکور الماری رکھی ہے جس میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر ایک فیرنٹی ریڈیو پڑا ہے جو ہر شخص کے ہاتھ پہچانتا ہے سوائے گھر والوں میں فارغ بخاری اور مہمانوں میں سید ضیا جعفری کے ---------- کمرے کی شکل سال میں دو مرتبہ روپ بدلتی ہے۔ سردیوں میں زمین پر گھاس ڈال دی جاتی ہے اور اس پر قالین بچھا دیا جاتا ہے دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگا دیئے جاتے ہیں اور کمرے کے مرکز میں کوئلوں سے دہکتی ہوئی ایک منقل رکھ دی جاتی ہے۔

گرمیوں میں گھاس ہٹا دی جاتی ہے اور قالین کے نیچے دری بچھا دی جاتی ہے دروازے کی طرف پانچ چھ کرسیاں ڈال دی جاتی ہیں سامنے دیوار کے ساتھ

دنیا کا سب سے پہلا صوفہ رکھ دیا جاتا ہے یہ صوفہ عین حضرت نوح کی کشتی ہے اور اس میں انسانوں سے لے کر جانوروں تک دونوں قسم کی چیزیں دستیاب ہو جاتی ہیں ---------- مالک مکان کو بارہا مشورہ دیا گیا کہ یہ صوفہ اب عجائب گھر میں رکھ دیا جائے تو اس میں نہ صرف صوفے اور مکان کی بہتری ہے بلکہ عوام اور تاریخ کے طالب علم کا بھی بہت فائدہ ہوگا لیکن وہ کافر اسے عجائب گھر لے جانے کی بجائے سردیوں میں اسے اپنے میڈیکل ہال میں ڈال دیتا ہے کیونکہ یہ صرف بیٹھنے ہی کا نہیں بلکہ پورے وارڈ کا کام دیتا ہے جس میں کم از کم دس بستر لگ سکتے ہیں منقل کی جگہ ایک ننھا سا برقی پنکھا لے لیتا ہے جس کی توجہ حاصل کرنے کی ہر شخص کوشش کرتا ہے اور جو بڑی باوقار بے توجہی سے اپنی [illegible] میں ہلاتا رہتا ہے۔

جی ہاں تو یہ ہے وہ کمرہ جس کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں اس کمرے میں کوئی خاص بات نہیں سوائے اس کے کہ یہ ایک کمرہ ہے لیکن اگر مسئلہ تناسخ کی رو سے دیکھا جائے تو اس کمرے نے کئی جونیں بدلی ہیں پہلے اس کمرے نے کوچہ رسالدار میں غلام حسین مسگر کی دکان کی صورت اختیار کی جہاں سرحد کی ہندکو زبان کے غالب استاد احمد علی سائیں، استاد جگر کاظمی، خان محمد عاصی، مسجدی شاہ خادم اور خود غلام حسین مسگر نے یکجا ہو کر پشاور میں ادب و شعر کے ذوق کو پروان چڑھانے کی ابتدا کی - کوچہ رسالدار ہی میں اس کمرے نے جعفر علی جعفری کی دکان کو اپنا مسکن بنایا جہاں میر عباس میر، سید جعفری، امانت علی امانت، سید ضیا جعفری اور خود جعفر علی جعفری اور قمر علی قمر سرحدی شعر و سخن کے ہنگامے جگاتے رہے - یہی وہ کمرہ تھا جہاں سردار عبدالرب نشتر کی شاعری نے جنم لیا اور جہاں نشتر صاحب کے بزرگ انہیں تلاش کرتے کرتے دکان کے کنویں سے باہر نکالتے کوچہ رسالدار ہی وہ پہلا میدان تھا جہاں بزم سخن اور لطف سخن کے ادبی معرکے ہوئے اور جہاں قمر سرحدی نے اس غرض کے لئے اپنا الگ ریستوران کھولا یہاں آغا میر عباس میر کے قہوہ خانوں نے ادب و شعر کی اشتہا بڑھائی - پھر یہ کمرہ شاہ ولی قتال کا مجاور بنا

اور دائرہ ادبیہ کہلایا پھر یہ بورژوا ہوگیا اور محلہ خداداد کے ایک بالا خانے پر جا پہنچا اور ایک قدیم ترین پیپل کے درخت کی ہمسری کرنے لگا پھر یہ پرولتاری ہوگیا اور زمین پر اتر آیا اور جہاں ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے بکائن واقع ہے وہاں اس کی چھاؤں میں آباد ہوگیا۔

پھر یہی کمرہ مختلف جگہوں پر نقل مکانی کرتا رہا کبھی زیادہ عرصے کبھی کم ---------- کبھی یہ شاہ ولی قتال میں عبدالودود قمر کے گھر میں منتقل ہوا کبھی سید مظہر گیلانی کی رہائش گاہ ضیغم لاج میں اور کبھی اس نے انشاط ہوٹل کے بڑے ہال کو ٹھکانا بنایا کبھی اس نے شاہی مہمان خانے میں کبھی پشاور یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر علی خان کے مشہور بنگلہ نمبر پی پانچ میں محفل جمائی کبھی محمد شاہ برق کوہاٹی کے ہاں ------ کبھی اباسین آرٹس کونسل میں کبھی ریڈیو پاکستان پشاور کے اسٹوڈیوز میں، کبھی چکلالہ پاکستان ٹیلی ویژن راولپنڈی اسلام آباد میں اور کبھی موجودہ پشاور ریڈیو کے اس احاطے میں جو کسی زمانے میں رلے کا باغ کہلاتا تھا اور جہاں ہندو مسلم اور سکھ بلکہ عیسائی شاعر بھی آجاتے تھے کبھی احمد فراز کے ہاں اور کبھی محسن احسان کے کرنا کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے لان میں ------ لیکن اس وقت میں اس کمرے کا ذکر کرنے لگا ہوں جسے سرحد کی ادبیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے یعنی شاہ ولی قتال کے دروازے کے ساتھ والا کمرہ ------- اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں ہے نہ یہ فن تعمیر کا کوئی اعلیٰ نمونہ ہے نہ اس کی آرائش و زیبائش میں کوئی خاص بات یا سلیقہ ہے جسے دیکھنے کو آپ کا جی بھی چاہنے لگے اور نہ اس میں کسی بہت بڑے مصور کی کوئی شاہکار تصویر آویزاں ہے ------ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ یہاں بڑے بڑے دماغ اور بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہوتی رہی ہیں شاعر، ادیب، مصور، موسیقار، صداکار، ڈاکٹر، حکیم، پروفیسر، ماہر فن تعلیم، سرکاری افسر، صحافی، وکیل، تاجر اور سیاستدان۔

بڑے بڑے آدمی یہاں آکر اپنے کپڑوں پر گرد جمنے کی فکر نہیں کرتے وہ

کسی چھوٹے آدمی کے پاس بیٹھنے میں گھن محسوس نہیں کرتے، نہ ہی کھیل کی باتیں کرنے اور کھیل کھیلنے سے ان کے وقار کو دھچکا لگتا ہے اور نہ وہ اپنے کردار، شخصیت یا فن پاروں پر تنقید کو اپنی بے عزتی خیال کرتے ہیں --------- وہ خلوص لے کر آتے ہیں اور محبت لے چلے جاتے ہیں۔

جب پشاور پر شام کا دھندلکا پھیل جاتا ہے لوگ اپنے اپنے کاروبار سے فارغ ہونے لگتے ہیں تو اس کمرے کی رونق بننے لگتی ہے اور شاعر ادیب آرٹسٹ صوفی پروفیسر ایڈیٹر اور وغیرہ وغیرہ آنے لگتے ہیں اور پھر یہ کمرہ بھانت بھانت کی بولیوں سے گونج اٹھتا ہے اور پھر یہ گونج اس کمرے میں محفوظ ہو کر رہ جاتی ہے الکل یوں جیسے ٹیپ پر آواز ثبت ہو کر رہ جاتی ہے یہ کمرہ ایسی کتنی ہی گزشتہ حسین اور انمول یادوں کا امین ہے اس میں اب تک کتنی ہی آوازیں گونج رہی ہیں --------- حفیظ جالندھری کی دھمکیں، احمد ندیم قاسمی کے لطیفے، ن م راشد کی نظمیں، قتیل شفائی کے گیت، ادیب سہارنپوری کا ترنم، ظہیر کاشمیری کی تقریریں، مجید لاہوری کا مزاح، انصار ناصری کی باتیں، یاس یگانہ چنگیزی کا اردو اور فارسی کلام، حسرت موہانی کی غزلیں اور علامہ تاجور نجیب آبادی کی بذلہ سنجیاں --------- اسے اب تک سب کچھ یاد ہیں اس میں مجید شاہد کی غزلیں جو برف سے ڈھکے ہوئے کوئٹہ کے ایک مکان کے آخری کمرے میں صندلی ڈالے بادام کھانے کے لئے ہجرت کر گیا اور طاہر فاروقی کی بھونی ہوئی سونف جو مشرقی بنگال اور ترکی میں بھی خوشبوئیں پھیلاتی رہی اور زیڈ اے بخاری کی پرخلوص بے تکلفی اور شاہ ولی قتال کی مسجد کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے والے لکڑی کے اڈانوں (شہتیروں) سے گلے مل مل کر روتے اور امیر حمزہ شنواری کی تصوف اور فلسفہ پر بحثیں اور مولانا حسرت موہانی کا تغزل، روش صدیقی اور سیماب اکبر آبادی کے اشعار اور سردار عبدالرب نشتر اور ملک خدا بخش کی صدارتیں اور ساحر لدھیانوی کی نظمیں اور سید عابد علی عابد کی خیال افروز باتیں اور رشید اختر ندوی کے تبرے، شورش کاشمیری کے انقلابی حوصلے، نثار کا شباب اور انور امیر اور حبیب اشیائی کی جوانا مرگیاں، اور چودھری برکت علی کے قہقہے اور شوکت واسطی کے گیت، شاہد احمد دہلوی کی پروقار گفتگو، مختار صدیقی کی اردو سی حرفیاں اور مسعود قریشی اور احمد ظفر اور جمیل ملک اور منظور عارف اور عبدالعزیز فطرت اور حفیظ اثر اور فیضی اور ملک راحت کے افسانے اور تحقیقی مضامین اور مقصود زاہدی کی رباعیات اور احمد راہی کے ترنجی گیت اور صادق نسیم کے اشعار --------- اور ان یادوں کے علاوہ اس کمرے میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی باتیں آئندہ کے لئے حسین یادیں بن کر رہ جائیں گی - لیجئے امیر حمزہ شنواری تشریف لے آئے - ان کے ساتھ ایک سنجیدہ صورت کے کلین شیو بزرگ تشریف لائے ہیں - یہ غیر ملکی سہی لیکن پکے مسلمان ہیں - جلا وطنی کے دن پشاور میں گزار رہے ہیں وہ نظر بند بھی ہیں آزاد بھی ہیں - یہ مشہور زمانہ شخصیت موسیٰ جار اللہ - ذرا ان کا تعارف ان کے رہنما امیر حمزہ شنواری کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں -

"جنگ عظیم دوم کے دوران روس کے عظیم عالم حضرت موسیٰ جار اللہ صاحب ہوٹل تاج محل بیرون ڈبگری بازار پشاور میں نظر بند تھے نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے "اعلیٰ حضرت" محمد ظاہر شاہ والئے افغانستان کو لکھا کہ اگر انہیں تھوڑی سی فوج بھی دی جائے تو وہ بخارا پر قبضہ کر لیں گے کیونکہ وہاں کے باشندے ان کے معتقد ہیں سوئے اتفاق سے وہ خط سی آئی ڈی کے ہاتھ آگیا اور آپ کو نظر بند کر دیا گیا ان کی خدمت میں ہمیشہ فارغ التحصیل علماء کا جمگھٹا رہتا اور ان سے علمی استفادہ کرتا چنانچہ میں بھی خدمت میں حاضر ہونے لگا اور ہوتے ہوتے اچھے تعلقات قائم ہوگئے بات چیت فارسی میں ہوتی تھی اور میں ٹوٹی پھوٹی فارسی میں اپنا مقصد بیان کر دیا کرتا تھا چنانچہ ایک دن جب میں نے پوچھا "مولانا آپ کی تعلیم کہاں تک ہے" مسکرا کر فرمایا دنیا میں کوئی ایسا بڑا علمی ادارہ نہیں جس کا دروازہ میں نے نہ کھٹکھٹایا ہو - اور پھر اپنی ڈگریوں کو شمار کرنے لگے اور میں حیرت سے سنتا

رہا - معلوم ہوا کہ انہوں نے عربی زبان میں 118 کتابیں لکھیں ہیں میں نے پوچھا کہ
مولانا آپ داڑھی کیوں منڈواتے ہیں فرمایا "اپنی بہترین عقل کو اس قسم کے
معمول مسائل میں نہ الجھایا کرو - داڑھی لباس کی قسم سے ہے" میں نے کہا کہ
مولانا ! عریاں رہنا بھی تو اچھا نہیں ہوتا - مسکرا کر فرمایا "عریانی بھی لباس ہی کی ایک
قسم ہے -"

موسیٰ جار اللہ صاحب سے ضیا صاحب کے تعلقات بھی قائم ہوگئے چنانچہ
ایک دن انہیں دائرہ ادبیہ میں مدعو کیا گیا میں بھی ساتھ تھا وہاں جو نوجوان شعرا
تھے وہ ذرا آزاد واقع ہوئے تھے اس لئے واپسی پر مجھ سے فرمانے لگے "یہ دائرہ
ادبیہ تھا - میں نے تو وہاں کوئی ادب نہیں دیکھا -" میں نے ان سے عرض کیا وہ
آپ کی غفلت اور کارناموں سے بیگانہ تھے آپ ان سے صحیح طور پر متعارف نہ
ہوسکے -

لیجئے ریڈیو کے پاس رضا ہمدانی نیم دراز ہے جس کے بال سفید ہوتے
جارہے ہیں اور جس کے چہرے پر ابھی جوانی کے گلاب کھل رہے ہیں اس کے پاس
ہی فارغ بخاری بیٹھا ہے جی یہ برمی نہیں لیکن برما میں کافی عرصہ رہ چکا ہے رضا
اور فارغ - دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے نہ دیکھا اور نہ پرکھا جاسکتا -
البتہ تیسرا شخص ان کے درمیان آئے تو چکی کے دو پاٹوں میں دانہ گندم کی طرح
شاید پس جائے یہ ایک دوسرے کے ازلی اور ابدی سہارے ہیں سرحد میں ان
دونوں نے مل کر اپنے خون جگر سے ادب کی آبیاری کی ، سنگ میل ان کی کاوشوں
کی حسین یادگار اور ٹھوس حقیقت ہے جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا یہ دونوں ادب کے
انتھک خادم ہیں اس کمرے میں لوگ حسب معمول باتوں ، چٹکلوں اور قہقہوں میں
مصروف ہیں اور یہ چپکے سے سب کے ہاتھ میں ایک ایک کتاب تھما دیتے ہیں یہ
کتاب کبھی "خوشحال خان کے افکار" کی صورت میں ہوتی ہے ، کبھی رحمان بابا کے
افکار کے رنگ میں ---------- کبھی مجموعہ شعر ----- وہ آگے ہی آگے بڑھتے

جارہے ہیں ان کی کاوشوں کی وجہ سے اردو اور پشتو دونوں زبانوں کے ادب اور
ادیب ان کے احسان مند ہیں - ان کا کام صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اردو غزل
اور نظم میں بھی نئی زندگی پھونکی ہے انہوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر شعور کا
سہارا لیا ہے اور نظم اور غزل دونوں میں زندگی کے انقلابی رجحانات سمو دیئے ہیں

فارغ سے ذرا ہٹ کر شمیم بھیروی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور اپنا پیٹ
تھپ تھپا رہا ہے بالکل نیاز فتح پوری جیسی وضع قطع اور ڈیل ڈول ------ سرحد میں
جدید ادب کی نشوونما میں شمیم بھیروی کا بڑا حصہ ہے دائرہ ادبیہ کے دور میں شمیم
نے بڑے پیارے افسانے لکھے منٹو کے لڑکپن کے زمانے میں شمیم نے وہ طرز اپنایا
جو بعد میں منٹو کی شہرت کا باعث بنا ، شمیم کے افسانوں نے جدید لکھنے والوں کو بڑا
فائدہ پہنچایا - افسانہ ، مقالہ ، نظم ، غزل ، قطعہ ، رباعی ، تنقید ، ترجمہ غرض ادب کے
تقریباً سبھی شعبوں پر یکساں طور پر حاوی اور قلم برداشتہ ہر موضوع پر لکھ سکنے
والا لیکن اپنی طرح بھاری بھرکم الفاظ کا دلدادہ ہے بمبئی میں وہ فلمی اخبار نویسی بھی
کرچکا ہے ایک فلمی مرکز میں رہ کر فلموں سے متعلق ہونے کی بناء پر وہ اس
موضوع پر بھی بے تکان تنقید کرسکتا ہے بمبئی کی ادبی محفلوں میں اس کے شعر اب
بھی گونجتے ہیں بنگال میں اس نے زندگی کا کچھ حصہ گزارا لیکن ہاں کسی ساحر یا
ساحرہ ظالم نے اس پر جادو کردیا ہے جو اب تک نہیں اترا - چنانچہ آج بھی اس
جادو کا اثر جاگتا ہے تو شمیم پر جنون کے دورے پڑنے لگتے ہیں -

لیجئے شمیم سے اس طرف ضیاء جعفری صاحب بیٹھے لمبی لمبی آہیں بھر رہے
ہیں اس وقت ان کے ذہن میں دینیات کی گھنٹی بج چکی ہے اور تصوف پر لیکچر دے
رہے ہیں باتیں کرتے کرتے وہ آنکھیں بند کرلیتے ہیں - یہ جذب و مستی کا عالم ہے
دیکھئے وہ ڈوب گئے - لیجئے وہ پھر ابھرے ایک طویل پاٹ دار آواز میں - آہ کھینچنے کے
بعد وہ پھر بولنے لگے ------ ضیاء جعفری سرحد کے ادیبوں میں نمایاں ترین شخصیت

کے مالک ہیں انہوں نے ادب کو نئے الفاظ، نئی ترکیبیں، نئی تراشیں اور نیا درد دیا، انہوں نے رباعی کو اپنایا اور اپنے پرخلوص درد اور سوز اور معرفت کی شراب بخشی ان کی رباعی محض چار مصرعوں کا مجموعہ ہی نہیں ایک بیکراں سمندر اور ایک اور لامحدود دنیا کا افسانہ ہے جس میں آپ جو چاہیں تلاش کرسکتے ہیں ان کی یہ لامحدود دنیا "صبوحی" کے نام سے کتابی صورت میں سمٹ چکی ہے ان کی اردو اور فارسی غزلوں میں زندگی کا رس ہے، شیریں اور زندگی آموز۔ ان میں حساس اور جواں دلوں کی تیز دھڑکنیں ہیں اور حافظ اور سعدی اور خیام کی بولتی ہوئی روحیں

خیام سرحد کی عمر ڈھل چکی ہے لیکن ان کا دل اور دماغ جوان ہے ان کے اعضا میں شباب ہلکورے لیتا رہا ہے۔ اور ان کے چہرے پر جوانی کی چکاچوند برقرار رہی ہے ضیا اس کمرے کی جان ہیں جن کے دم سے اس فضا میں قہقہے پھلجڑیوں کی طرح چھوٹتے ہیں اور ان کا ہلکا ہلکا زندہ مزاح اور ان کی جواں جواں شرارتیں ------ سدا اس محفل کی رونقیں بڑھاتی رہی ہیں وہ اس مجلس کے روشنی کے مینار ہیں اور اب یہ روشنی کا مینار ایک مزار کی صورت میں حضرت شیخ جنید صاحب رحمت اللہ علیہ کے مزار کے بالمقابل مرجع خلائق ہے۔

جی ہاں اس مینار کی روشنی میں جو خوش رو اور ہنستا ہوا چہرہ نظر آرہا ہے وہ عبدالودود قمر ہے سرحد میں ادب کا انتھک کارکن اس نے شعر بھی کہے اور مقالے بھی لکھے ہیں لیکن ان کی وجہ شہرت سے انگریزی اخباروں کے مراسلہ نگاری ہے لیکن اسے اپنے شاعر اور ادیب ہونے کا قطعاً" دعویٰ نہیں وہ مجلس میں کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر یا ادیب نہ ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود اس نے ادب کی خدمت اچھے اچھے شعراء اور ادبا سے کہیں زیادہ کی ہے وہ ایک بہترین منتظم ہے سرحد میں ادب کا ذکر کرتے ہوئے عبدالودود قمر بی اے کا ذکر چھوڑ دینے کا مطلب ہے کہ ادب کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ عبدالودود قمر ادیب نہیں خود ادب ہے وہ شاعر نہیں خود شاعری ہے اس نے

ادیبوں اور شاعروں کو چراغ بخشے ہیں کہ وہ راستے سے بھٹک نہ جائیں انہوں نے ادب کی پرپیچ اور تنگ پگڈنڈیوں پر نوجوانوں کی رہنمائی کی ہے۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ انگریزی اخبارات میں مکتوب نگاری آخری عمر تک جاری رہا ہے یہ خطوط ان کی تنقیدی حس کے مجسم ثبوت ہیں میڈیکل کالج کی تعلیم ادھوری رہنے کے باوجود دوستوں نے ہمیشہ انہیں ڈاکٹر صاحب کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔

یہ ان کے پاس ہی چترالی ٹوپی پہنے اور کشمیری دوشالہ اوڑھے ایک نیم بزرگ سے صاحب قہقہوں کی بوریاں الٹ رہے ہیں یہ نذیر مرزا برلاس ہیں انہوں نے سرحد میں نظم کی "طرح نو" ڈالی ان کی پیاری پیاری اور دلکش رومانی نظموں نے نوجوانوں کے رجحانات کو جدیدیت سے آشنا کیا۔ ان کی نظموں میں شفق کی رنگینیاں افق کے پار کی خوابناک بستیاں اور قصہ خوانی کی رونقیں اور ان رونقوں میں دنیا کے کھلے ہوئے دکھ اور ان سے ہٹ کر جہلم کے کنارے بیری کا درخت اور ان کا جوانی کے دور کا رومان سب کچھ ہے ان نظموں میں زندگی اور زندگی کی شفق رنگ اور سنہری حقیقتیں ہیں محبت ہے خلوص ہے ان نظموں نے سرحد کی ادبیات کو ایک نئے اور واضح موڑ سے آشنا کیا ہے اس منظوم انقلاب نے "طرح نو" کے نام سے کتابی صورت بھی لی ہے جو پہلی مرتبہ مکتبہ اردو لاہور نے شائع کی۔

ایران سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد پشاور یونیورسٹی میں فارسی کے شعبے سے منسلک ہوگئے اور پھر گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ایسے ریٹائر ہوئے کہ اپنے کمرے کو اپنی جنت بنا لیا یہ سارے عظیم لوگ گ جن کا ابھی ابھی تعارف ہوچکا ہے ان سب نے ابتداء ہی سے اس کمرے کا ساتھ دیا ہے۔ دائرہ ادبیہ سے ادبستان اور ادبستان سے انجمن ترقی اردو تک اور پھر انجمن ترقی اردو سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک تک۔ انہی لوگوں کے دم قدم سے یہاں کے ادب کا چراغ اب تک صرف روشن ہی نہیں جگمگا کر ماحول

میں اجالے پھیلا رہا ہے ان ہی کی صحبت میں خاطر غزنوی نے شعر کہنا سیکھا۔ مجید شاہد نے اپنی غزلوں سے عوام کو چونکایا اور احمد فراز کو ادبی بلند قامتی حاصل ہوئی انہی کے دم قدم سے محسن احسان نے نام پایا اور یوسف رجا اور فرید عرش اور یعقوب نظر اور اختر جعفری اور مسعود انور شفقی اور تاج سعید نے اردو ادب کے چمن میں آب یاری کا حوصلہ پایا۔ مظہر گیلانی اور عشرت ملک ان کے دو دیرینہ ساتھی ہیں جو اس وقت یہاں نہیں لیکن جنہوں نے ان کا آخر دم تک ساتھ دیا ہے مظہر ادبستان کا البیلا شاعر ہے جس نے اپنی غزلوں میں ساغر چھلکائے اور جس نے مخمور ہو کر اکثر ساقی کو بھی سنبھالا دیا پھر وہ ادب سے کسی حد تک کنارہ کش ہو گیا اس نے عروس سیاست کو اپنا لیا لیکن اس کمرے کو اس کی چہلیں اور اس کی غزلیں اور اس کا بے باکانہ خلوص کبھی نہیں بھول سکتا مظہر ادب کی ٹھوس خدمت کر چکا ہے اس کا ڈرامہ "تسلیم" اور افسانے "رنگین مشاہدے" اور "بدنصیب سارہ" شائع ہو کر تحسین عوام حاصل کر چکے ہیں جہاں وہ کبھی کبھی ایوان ادب میں در آیا کرتا سیاست نے اس شاعر کو اپنی مملکت میں کھینچا لیکن موت کی مملکت میں جا کر کوئی واپس نہیں آتا اس کمرے میں عشرت ملک کے قہقہے اور پھر ہنستے ہنستے کھانسی کے دورے پڑنے بھی اچھی طرح یاد ہیں عشرت جو حد درجہ ہنسوڑ تھا مگر کچھ اس طرح دنیا کے تھپیڑوں کی زد میں آگیا کہ اسے اپنا وطن چھوڑتے ہی بنی۔ کراچی میں رکشوں کے پرشور کاروبار میں اپنی غزلوں کی رنگینیاں بھول گیا کوہاٹ میں ٹھیکے لے کر زیر بار ہوا اور آخر پشاور واپس آکر ایک کنج چمن میں عافیت کی راہ ڈھونڈ نکالی لیکن کنج عافیت تو صرف قبر ہے یہ کمرہ ان کی غزلوں کو کہاں بھلا سکتا ہے یہ کمرہ جو حقیقت میں کمرہ نہیں سرحد کی ادبیات کی ایک مبسوط تاریخ ہے۔

آیئے اس کمرے کی پوری ۔ک دیکھئے ابھی تھوڑی دیر میں دوسرے احباب آنا شروع ہوں گے اور کمرہ کھچا کھچ بھر جائے گا اور پھر ضیاء جعفری صاحب، حافظ شیرازی یا نظیری یا غالب یا اقبال کے اشعار سنائیں گے اور انکی تشریح اور

تفسیر کریں گے اور آنے والے علم و عرفان سے اپنی جھولیاں بھر بھر کر لے جائیں گے۔

پھر قہوہ آئے گا اور رضا آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائے گا اور مزے لے کر قہوہ بنائے گا اور قہوے کی پیالیاں تقسیم ہونی شروع ہو جائیں گی اور ذہنوں کی جلا پانے والے کام و دہن کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوں گے عبدالودود قمر اپنی جیب سے لیموں نکال کر اس کا رس پیالیوں میں ٹپکانا شروع کر دیں گے کمرہ، قمر صاحب کے لیموں سمیت محلہ خداداد ہجرت کر جائے گا۔ اور جب یہاں بھی قہوے کا دور ختم ہو جائے گا تو رضا پیالیاں سمیٹے گا اور پھر فارغ سے کہے گا کہ برتن اوپر لے جائے اور فارغ حسب معمول کہے گا "نا بابا! مجھ سے یہ برتن اوپر نہ لے جائے جا سکیں گے" اور رضا اور فارغ اس بات پر گتھم گتھا ہو جائیں گے اور ان کے دوستوں کے قہقہے ان کی ہمت افزائیں کریں گے اور آخر رضا ہار مان کر برتن اوپر لے جائے گا۔

باہر سائیکل رکھنے کی آواز آتی ہے وہ لیجئے دروازہ کھلتا ہے --------- اور خاطر سرد ہاتھوں پر پھونکیں مارتا داخل ہوتا ہے۔

سلام دعا -------- گلے شکوے ------- تازہ خبریں -------- اور پھر وہ گوشے میں پڑے ہوئے ریڈیو کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے۔ لیجئے دروازہ پھر کھلتا ہے۔

یہ شیخ ثناء اللہ ہیں سرحد کے واحد انگریزی روزنامے "خیبر میل" کے ایڈیٹر اور خیبر میل کے مالک --------- ان کے بال دھنکی ہوئی روئی کی طرح سفید ہیں اور چہرہ یوں دھک رہا ہے جیسے یہ ابھی ابھی گرمی کی دوپہر کی دھوپ سے اٹھ کر آئے ہیں اور دھوپ میں ان کے بال سفید ہو گئے ہیں اور چہرہ تمازت سے سرخ -------- لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے یہ بال زندگی کے گرم اور سرد دیکھ کر سفید ہوئے ہیں اور وہ بوڑھے ہو کر بھی اسی لئے جوان ہیں کہ انہوں نے کبھی غم کو اپنے پاس پھٹکنے ہی نہیں دیا وہ تکلیفوں میں گھر کر

بھی ہنستے رہے - یوں تو یہ بھی ہنستے ہی رہتے ہیں اور کسی سنجیدہ سے سنجیدہ محفل میں بھی بیٹھے ہوں تب بھی اپنی فطری بذلہ سنجی سے محفل کی سنجیدگی کا سہاگ لوٹ لیتے ہیں یوں محنتوں کے پہاڑ کھودنے کے تجربوں سے جھولی بھر لینے کے بعد ان کے بال سفید ہوئے ہیں ان کے چہرے پر ہمت استقلال اور جرات کی سرخیاں ہیں ---------- ان کے ہونٹ ترو تازہ ہیں وہ ابھی ابھی قصہ خوانی میں لاہوری حلوائی کی دکان سے گلاب جامن اور اندر سے اور جلیبیاں کھا کر بغیر ہونٹ صاف کئے آگئے ہیں یا پھر مولوی گھی سٹور کے آگے بیٹھے ہوئے گنڈیری والے سے گنڈیریاں لے کر سوچتے ہوئے ادھر ہی آرہے ہیں اور گنے کے رس نے ان کے ہونٹوں پر تازگیاں بکھیر دی ہیں -

وہ پشاور جیسے دور افتادہ شہر میں ہیں - لیکن دنیا کے اہم ترین شہروں کے کثیر الاشاعت اخباروں کی نمائندگی بھی کرتے رہے ہیں اسی لیے یہ کمرہ تو ان کی شخصیت کے حسن اور معلومات کی وسعتوں سے سدا دمکتا رہتا ہے -

دروازہ پھر کھلتا ہے اور خاطر چلاتا ہے -

"ارے احسان" ----------

"جی ہاں" یوسف رجا چشتی پہلے ہی بول کر اپنی آمد کا اعلان بھی کرتا ہے -

"ارے تم بھی آگئے" - -----

اور پھر ریڈیو کے پاس جابیٹھتا ہے اور حسب معمول ریڈیو کی سوئی گھمانے کی مشق شروع کردیتا ہے فلمی ریکارڈ بج رہا ہے وہ اس کی آواز تیز کردیتا ہے اور سبھی چڑ کر کہتے ہیں -

"خدا کے لئے بند کرو ریڈیو --------- کچھ باتیں کرنے دو --------"

"آہاہا --------- بڑا اچھی فلمی گانا ہے - یہ ریکارڈ سننے دیجئے -------- بس پھر بند کردوں گا"

"میں تو نہیں سنتا" اور ضیا صاحب کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں -

ابو جہل ہے ابو جہل ہے ---------- فارغ چلاتا ہے -

اور ابو جہل ریڈیو بند کردیتا ہے -

آج ایک مہمان کی آمد کا انتظار ہے -

نو بج جاتے ہیں اور مہمان نہیں آتا -

رضا کہتا ہے شاید اب نہ آئے ------- اب یہاں کوئی نہیں --- کوئی نہیں آئے گا -------- خاطر فیض کے مصرعے پر پکے گانے کی مشق شروع کردیتا ہے

"یقیناً" اب نہیں آئے گا" --------- فارغ تائید کرتا ہے --------

مصطفیٰ بیٹا کھانا لے آؤ ----------

کھانا آجاتا ہے ----------

قمر صاحب آیئے

آؤ احسان -------- شمیم

خاطر------------!

رجا بھیا آجاؤ -----------

ضیاء صاحب ہاتھ دھونے نلکے پر چلے جاتے ہیں شمیم صاحب ہاتھ کی پشت سے ناک صاف کرتے ہوئے دستر خوان پر آبیٹھا ہے رضا کہتا ہے شمیم یار تمہارا ہاتھ تو صاف ہے ہاتھ کی پشت تو دھو آؤ - شمیم ہاتھ دھونے کے لئے جاتے ہوئے کہتا ہے "میں ہاتھ کی پشت سے کھانا نہیں کھایا کرتا" -

قہوہ ، کھانا ، شعر ، مقالے ، کہانیاں ، نئی کتابوں پر خیال آرائی ، تازہ ادبی مجلوں سے نمایاں منظومات اور مضامین کی خواندگی ------- تنقید ، بحثیں ، مذاق ، محبت ، ہمدردیاں --------- ان سب کے مجموعے کا نام ہے یہ کمرہ - کوئی بھی صاحب ادب یا صاحب ذوق باہر سے پشاور آجائے اور پشاور کے کسی بھی لکھنے والے سے ملنا چاہے تو اسے کہیں نہیں بھٹکنا پڑتا بس اس کمرے میں پہنچ جائے

منزل مقصود کو پہنچ جائے گا - چاہے یہ منزل مقصود شاہ ولی قتال ہو یا محلّہ خداداد

یہ کمرہ بہت سی خصوصیات اپنے سینے میں لئے ہے -------- جو بھی یہاں آجائے اس کمرے میں داخل ہوجائے --------- اس کے دل سے ساری کدورتیں سارے وسوسے سارے شکوک حمام میں لباس کی طرح اتر جاتے ہیں -

اسے بھی حمام بھی کہا جاسکتا ہے ---------- کان نمک بھی - کیونکہ اس کمرے میں خلوص محبت اور پیار ہی پیار ہے یہاں آکر دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف ہوجاتے ہیں - دل میں صاف ادب و شعر اور علم اور حصول علم کی لگن آجاتی ہے -

یہاں صرف تنقید رہ جاتی ہے تنقیص باہر رہ جاتی ہے -

بحثیں ہوتی ہیں کج بحثیاں نہیں

مذاق ہوتا ہے گالیاں ذہنوں سے محو ہوجاتی ہیں -

یہاں آنے والا نفرت دہلیز کے باہر چھوڑ آتا ہے اور محبت اور صرف محبت لے کر اندر داخل ہوتا ہے -

اس کمرے میں ایک اور بھی بڑی دلچسپ خصوصیت ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ اکثر منتقل ہوتا رہتا ہے مثلاً" تین دن سے خاطر نہیں آیا - اڑتی سی ایک خبر آئی کہ بیمار ہے اور اس کمرے کے سارے بیٹھنے والے یعنی یہ کمرہ اٹھ کر خاطر کے گھر جا پہنچتا ہے اور وہاں خاطر تین دن سے بخار میں پھنک رہا ہے سب پریشان ہیں - رضا خاطر کا سر دبا رہا ہے فارغ اسے انجکشن دے رہا ہے - ضیا صاحب آیت کریمہ پڑھ پڑھ کر اس پر پھونک رہے ہیں لالہ مضمر خاطر کو تسلیاں دے رہا ہے اور فراز اور احسان گم صم کھڑے سوچ رہے ہیں کہ یہ تین دن میں کیا سے کیا ہوگیا -

پھر -------- بوستان کی شادی ہے اور یہ سارا کمرہ بوستان کے گھر منتقل ہوگیا ہے اور اس نے ایک اچھی خاصی برات کی صورت لے لی ہے - ضیا صاحب ' حکیم حسن عباسی صاحب بوستان کے پدر وکیل بن گئے ہیں -------- اور باقی لوگ

لالہ مضمر کو گھیرے میں لے کر اس کے منہ میں شادی کے قل ڈال رہے ہیں کہ اس کی شادی ان لوگوں کو دیکھنی نصیب ہو -------- لالے کی طرف سے سب مایوس ہیں پھر بھی ایک موہوم امید کی کرن ہر دل میں فروزاں ہے کہ شاید لالے کی شادی ہوجائے - بعض دوست لالے کے صاف ' بے بال وایال سر کا حوالہ دے کر کہتے ہیں جس دن اس کے سر پر کوئی بال اگ آیا لالے کی شادی ہوجائے گی اور جب سچ مچ لالے کی شادی ہوجاتی ہے تو سب گنگنا اٹھتے ہیں -

گوشے گوشے میں منادی ہوگئی
ہوگئی لالے کی شادی ہوگئی

آج ہے لالہ بچارا کتنا بے بس دیکھئے
یورش افکار سے پھولی ہے نس نس دیکھئے
ہوگیا ہے رنج و غم سے سوکھ کر خس دیکھئے
منہ سے کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں بس دیکھئے

گوشے گوشے میں منادی ہوگئی
ہوگئی لالے کی شادی ہوگئی

آگیا وہ دام آخر جس کا ڈر لالے کو تھا
مل گیا انعام آخر جس کا ڈر لالے کو تھا
آگئی وہ شام آخر جس کا ڈر لالے کو تھا
ہوگیا وہ کام آخر جس کا ڈر لالے کو تھا

گوشے گوشے میں منادی ہوگئی
ہوگئی لالے کی شادی ہوگئی

ہاتھ کچھ اس کا بٹا کر کچھ تو ہمدردی کرو
بوجھ کچھ اس کا اٹھا کر کچھ تو ہمدردی کرو
گر کوئی اس کو سکھا کر کچھ تو ہمدردی کرو

دوستو لالے سے آکر کچھ تو ہمدردی کرو
گوشے گوشے میں منادی ہوگئی
ہوگئی لالے کی شادی ہوگئی

اور ضیا جعفری صاحب اپنے صبوحی رنگ میں رباعیاں کہہ رہے ہیں

کس وقت ترا عقدہ کھلا ہے لالے
کس وقت ترا جام بھرا ہے لالے
لائے گا کہاں سے رنگ و بو کا احساس
کس وقت تجھے پھول ملا ہے لالے

○

احیائے جوانی کی تجھے حسرت ہے
اس عمر میں لالے یہ تری ہمت ہے
اللہ نے کیں ساری مرادیں پوری
لالے تری قسمت بھی عجب قسمت ہے

پھر یہ کمرہ یعقوب نظر کے ہاں جا پہنچتا ہے - احمد ندیم قاسمی میر مجلس ہیں یعقوب نظر سیٹھی خاندان کے خصوصی پکوان پیش کرتا ہے محفل ساری رات گرم رہتی ہے - احمد ندیم قاسمی تمام رات لطیفے سناتے رہتے ہیں - لیکن ان کا ذخیرہ ختم ہونے میں نہیں آتا حالانکہ ہنسنے والوں کے ہونٹوں کے گوشے کھچ کر کانوں سے جا لگتے ہیں اور واپس آنے کا نام نہیں لیتے - یہ دوسری بات یہ ہے کہ قہقہوں کا ذخیرہ ختم ہوجاتا ہے -

پھر کمرہ ضیا جعفری کے ہاں پہنچ جاتا ہے جہاں سعادت حسن منٹو پشاوریوں میں گھر جاتا ہے اور تڑپ کر کہہ اٹھتا ہے -

"پشاور کے رہنے والے پیش نہیں آتے ہیں درپیش آتے ہیں ۔"

اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی مطالعہ اقبال کے دفتر کھول دیتے ہیں -

اور پھر یہ کمرہ پشاور یونیورسٹی کے P-5 میں پہنچ جاتا ہے ڈاکٹر مظہر علی خان کی رہائش گاہ ------- جہاں جنوری کے پہلے ہفتے کا کوئی دن "یوم رومی" کے لئے مخصوص ہے پشاور کے بہترین قوال رات بھر فارسی کا منتخب کلام صحیح تلفظ کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اہل ذوق کے دلوں سے داد پورے خلوص سے نکلتی ہے پھر پی پانچ میں محرم کے ایام میں خاطر اور محسن احسان اور احمد فراز مرثیے انہیں سناتے ہیں اور ڈاکٹر مظہر علی خان ان مراثی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں میر انیس کے فن کے جوہر یہیں کھلتے ہیں - شیکسپیئر ، فردوسی اور گوئٹے کا فن اور انیس کا فن یہاں تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور علم کے چشمے ابلنے لگتے ہیں -

یہی کمرہ صدر کے کالی باڑی بازار میں ایک بالا خانے کی شکل اختیار کرلیتا ہے جہاں اردو سبھا کا دفتر آباد ہے - شوکت واسطی ایک محنتی اور نحیف و نزار لیکن تاریخ کے مضمون کا پہلوان طالب علم سرحد میں ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے کے لئے سرحد کے ادبی جغادریوں کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آگیا ہے جلترنگ کے نام سے نہ صرف اپنے گیتوں کا مجموعہ چھاپ چکا ہے بلکہ سرحد کے شعراء کے اشعار اور غزلوں کا مجموعہ اور مرزا محمود سرحدی کے اشعار کا انتخاب بھی چھاپ چکا ہے اگر فارغ رضا اور خاطر نے سنگ میل جاری کیا ہے تو شوکت واسطی بھی ان سے پیچھے نہیں رہا اس نے بھی ماہنامہ نوبہار جاری کردیا یہی حفیظ اثر کا ساتھی اور محسن احسان کا محسن ہے -

یہ کمرہ کہاں نہیں ہے یہ ریس کورس کی پشت پر جھیل روڈ کے اس کپڑے کے کارخانے میں بھی جا پہنچا ہے جہاں محبوب اختر نے ریشمی کپڑوں میں شعریت بننے کا اہتمام کیا تھا اور جہاں مرحوم امان اللہ نیازی ، احمد فراز ، عبداللہ عتیق ، فضل الرحمان اشک ، محسن احسان ، باقی صدیقی اور خاطر غزنوی مشاعروں کی محفلیں برپا کرتے رہے -

یہی کمرہ پشاور یونیورسٹی میں پریشان خٹک ، فراز ، محسن احسان اور خاطر

کے گھروں کا حصہ بن گیا، جہاں ابوالکلام ملیح آبادی صبح سویرے جوش ملیح آبادی کو
دلی کی نہاری یا پشاور کے پائے کھلاتے لاتے رہے جہاں احمد ندیم قاسمی، ایس ایس
نیازی، ذوالفقار علی بخاری، صادق نسیم، شہزاد احمد، کشور ناہید، ڈاکٹر وزیر آغا،
انور سدید، جمیل یوسف، قتیل شفائی، مرتضٰی برلاس، نصیر ترابی، استاد قمر جلالوی،
سید محمد جعفری، پروفیسر عبیداللہ درانی، ڈاکٹر مغنی، پروفیسر اسماعیل سیٹھی، شوکت
واسطی، حکیم محمد سعید، حمید احمد خان، حامد علی خان، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید
قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، منیر نیازی، ظہیر بابر، محمد طفیل، ڈاکٹر فرمان فتح پوری،
ابن انشاء، محمود شام، جمیل الدین عالی، امجد اسلام امجد، عطاالحق قاسمی، غلام
ربانی آگرو کی باتیں، پرمغز مقالے شگفتہ غزلیں اور دلکش نظمیں فضاؤں میں
کیفیتیں بکھیرتی رہیں۔ کبھی کبھی یہ کمرہ بدحائی جاپہنچتا ہے جہاں یوسف رجا چشتی
سب کو مصالحے دار گڑ پیش کرتا ہے کبھی ضیا صاحب کی سرگرمی میں یہ کمرہ ترناب
فارم پہنچ جاتا ہے۔ جہاں فضل علی شاہ مکان سے یوں لحاف نکالنا شروع کردیتا ہے
جیسے کوئی مداری اپنے منہ سے مسلسل رنگ برنگے کاغذ کبھی یہ کمرہ گرمیوں کے
دنوں میں ایک دھاچوکڑی کی صورت شیخ کے کٹھے پر جا پہنچتی ہے جہاں یہ سب
ریڈیو کے فن کاروں کی موسیقی سے لذت اندوز ہوتے ہیں حلوہ کھاتے ہیں اور پھر
نہر میں کود کود کر غوطے لگانے شروع کردیتے ہیں اور کسی نہ کسی کو پکڑ کر غوطے
دینے شروع کردیتے ہیں ----- کبھی یہ کمرہ سرگودھا اٹھ جاتا ہے کہ وہاں لالہ اکبر
سرحدی نے ایک کل پاکستان مشاعرے کا اہتمام کیا ہے کبھی کوہاٹ جاپہنچتا ہے کہ
وہاں اختر وارثی اور آذر سرحدی، ایوب صابر، دلبر شاہ اور عطوف شفیق اور محمود
شوکت کی محبت نے مشاعرے کا روپ لے لیا ہے ------ انجمن ترقی اردو کی پندرہ
روزہ نشستوں کے سلسلے میں تو یہ کمرہ باقاعدگی سے ہر پندھرواڑے مختلف احباب
کے گھروں میں ڈیرہ ڈال دیتا ہے کبھی مجید شاہد کے ہاں کبھی مظہر گیلانی کی ضیغم لاج
میں کبھی کبھی شفقی کے گھر کبھی منظور ملک تو کبھی شمیم بھیروی کے مکان پر۔ کبھی ضیا

صاحب کے ہاں ذوالفقار علی بخاری کے اعزاز میں صبح صبح شیر چائے (کشمیری
چائے) اور روغنی روٹی اور پایوں کا اہتمام ہے تو کبھی اس کمرے والے آدھی
رات کو ضیا صاحب کے ہاں جادھمکتے ہیں ضیا صاحب بجلی کے چولہے پر جلدی جلدی
قہوہ بناتے ہیں اور احباب قہوہ پیتے ہیں اور علمی بحثوں میں مصروف ہوجاتے ہیں
اور فارغ ضیا صاحب کی الماری سے صبوحی کی جلدیں نکال کر سب میں یوں بانٹنے
لگتا ہے جیسے شادی میں سہرے -------- اور جب کمرہ اپنے اصلی مقام پر آجاتا
ہے تو اچانک شیخ ثناء اللہ آدھمکتے ہیں اور آتے ہیں پوچھتے ہیں "سنا ہے آپ
سرگودھا گئے تھے" سب اقرار کرتے ہیں۔

"اور وہاں سے آپ کو تحفہ کے طور پر صابن ملا ہے" --------- اور سب
ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔کہ یہ بات تو جانے والوں کے سوا اور کسی کو
معلوم نہ تھی ---------- لیکن شیخ صاحب تو نیوز ایجنسی میں ہیں ان سے خبریں بھلا
کیسے چھپ سکتی ہیں۔

اتنے میں ایک اور ایڈیٹر آجاتے ہیں، یہ شریف فاروق ہیں، عبداللہ
منہاس اور نظیر لدھیانوی اور رفیق جاوید اور فائق کامران اور قدوس صہبائی کے
ساتھی --------- شریف فاروق آتے ہی کسی شرمیلی دلہن کی طرح ایک کونے میں
دبک جاتے ہیں وہ آنکھیں اٹھاتے ہیں تو یوں چونک کر جیسے کوئی بڑا جرم کرکے
آئے ہیں باتوں میں ایک حسین قسم کی معصوم گھبراہٹ ----- شہباز کی ادارت
سنبھالتے ہی انہوں نے اس روزنامے میں ایک حسین انقلاب پیدا کردیا ہے
---------- بڑے مخلص اور صاف دل --------- مرزا محمود سرحدی صاحب
کب آئیں گے -------- وہ پوچھتے ہیں "شہباز کے لئے ان سے ایک نظم لینا تھی"
---------- "کبھی تو نظم نہ لینے کے لئے بھی آیا کریں" فارغ کہتے ہیں۔

"وہ تو چند دنوں سے روٹھے ہوئے ہیں" --------- ایک صاحب کہتے ہیں
"کیوں" ------ شریف فاروق صاحب پوچھتے ہیں

"ان کا روٹھنا کسی "کیوں" کا مرہون منت نہیں" ------- برلاس صاحب کہتے ہیں۔

"خیر -------- لیکن ان کے مزاج میں بڑا طنز ہے ------ اور اس طنز میں تیکھا پن ہے میرے خیال میں وہ بڑے اچھے مزاح نگار ہیں"

"صاحب آپ کے نہیں سب کے خیال میں وہ بڑے اچھے مزاح نگار ہیں اور یہی سبب ہے کہ انہیں اکبر سرحد بھی کہتے ہیں" --------

حسب معمول دروازہ کھلتا ہے اور حکیم حسن عباسی صاحب داخل ہوتے ہیں چوڑی دار پائجامہ، سیاہ شیروانی، فرنچ کٹ داڑھی، دراز قد، خوبصورت لیکن کچھ سوچتی ہوئی آنکھیں اور سیاہ جناح کیپ سر پر۔ ان کے پیچھے یعقوب ہیں جن کے ہاتھوں میں چلغوزوں سے بھرا ہوا ایک لفافہ ہے اس کے پیچھے جیگار کی ٹوپی پہنے راولپنڈی الیکٹرک کمپنی کا منیجر بوستان اور بوستان کے بعد حبیب فخری بھوپالی ہے منحنی اور مختصر سے قد کا نوجوان ------ تنویر کا ایڈیٹر ------ حکیم صاحب دہکتی ہوئی منقل کے ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں اور یعقوب اور بوستان اور فخری ان کی پیروی کرتے ہیں یعقوب کمرے کے وسط میں چلغوزوں کا لفافہ الٹ دیتا ہے اور حاضرین کے منہ حرکت میں آجاتے ہیں۔

"آپ انہیں جانتے ہیں" ------ ضیا صاحب حکیم صاحب کی طرف اشارہ کرکے شریف فاروق سے پوچھتے ہیں۔

"نہیں" شریف فاروق کچھ اور سمٹ کر جواب دیتے ہیں۔

"آپ حکیم حسن عباسی -------- دواخانہ حکیم اجمل خان کی پشاور شاخ کے منیجر۔ آپ خاندانی حکیم ہیں -------- ادیب بھی ہیں اور ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی حکمت میں ادب بھی شامل ہوگیا ہے اور ان کے ادب میں حکمت گھل گئی ہے ------ "فلسفہ ان کا خاص موضوع ہے" ----------

"خوب" -------- اور اس کے ساتھ ہی دروازہ پھر سے زور سے کھلتا

ہے۔ اور ایک چوڑا چکلا اور ہنستا ہوا چہرہ کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔

"آج تو بڑی رونق ہے" ------- یہ نووارد کی آواز ہے

"آیئے، آیئے امداد صاحب" -------- اور امداد حسین بیگ تشریف لے آتے ہیں --------

آپ پروفیسر امداد حسین بیگ ہیں۔ پہلے ایڈورڈ کالج میں فارسی کے لیکچرار تھے پھر لندن تعلیمی مرکز کے مطالعے کے لئے تشریف لے گئے واپس آئے تو محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر سید یحییٰ شاہ کے پی اے لگ گئے پھر ضلع کے سکولوں کے انسپکٹر لگ گئے اور ساتھ ہی اسلامیہ سکول کے ہیڈ ماسٹر اور آخر میں پھر محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کے پی اے بن گئے ضیا صاحب حسب معمول تعارف کرانے کا پرانا فرض انجام دیتے ہیں اور پروفیسر مرزا امداد حسین بیگ اپنے لندن کے قصے سنانا شروع کردیتے ہیں ہوٹل کے غسل خانے میں ایک حبشی سے مڈبھیڑ سے لے کر ہائیڈ پارک میں ایک لڑکی سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے تک --------- اور پھر زمین دوز ریلوں کے رومانی سفر سے لے کر لندن کی زمین دوز گندگی کے نالوں میں اتر کر تین دن تک بخار میں مبتلا ہونے تک ------ بھئی کچھ اور۔ پھر اچانک وہ ایک مشہور شخصیت کی باتوں کی نقل اتارنا شروع کرتے ہیں اور پھر نقلوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ مرزا صاحب شہر بھر کی سب مشہور ہستیوں کے طرز تکلم میں ڈھل جاتے ہیں اور اپنے کمال کے بل بوتے پر سب کو اس محفل میں لاکھڑا کرتے ہیں اور محفل سب کچھ بھول جاتی ہے اور کمرے میں صرف دو آوازیں گونجنے لگتی ہیں مرزا امداد بیگ کی آوازیں میں کسی ہستی کی نقل بمطابق اصل اور احباب کے قہقہے ------- اور مرزا صاحب کی باتوں کے ساتھ ہی محفل اختتام پذیر ہوجاتی ہے۔

پھر اچانک ایک دن اس کمرے میں سارا لاہور جمع ہوجاتا ہے یہ ملک مبارک علی ہیں گوشہ ادب اور انشاء پریس کے کرتا دھرتا۔ لاغر سا جسم، نازک سا

چہرہ اور پتلی سی ناک جس پر چشمے کا مستقل ٹھکانہ - باتوں میں اتنی نزاکت کہ "ڑ" کو
"ر" اور "ر" کو "ڑ" کی رسیلی آواز دے چکے ہیں اور "گڑ" کو "گر" اور لکڑی کو
"لکری" کہتے ہیں -------- غالباً "ڑ" سے فرار کا سبب پریس کی اٹوٹ مشینی
گڑگڑاہٹیں ہوں، مشینوں کی گڑگڑاہٹوں سے بھاگ کر ان کی امن پسند طبیعت نے
فضائے محبت کی تلاش میں انہیں اس کمرے میں پناہ لینے پر مجبور کیا جی ہاں اس
کمرے میں جس نے ملک صاحب کی باتیں کم سنی ہیں اور نیندیں زیادہ دیکھی ہیں -

یہ ان کے ساتھ دوسرے مضبوط اور قد آور ادب کی قسم کے بظاہر سنجیدہ
سے شخص شیخ ایم اے اسلام ہیں سلام ایم اے نہیں اور گوشہ ادب کی روح
رواں ہیں اور انہوں نے قد آور ادب کی نشرو اشاعت کے لئے اچھی اچھی کتابیں
شائع کی ہیں ------- قصور سے نجانے کس قصور کی پاداش میں وہ لاہور آگئے اور
لاہور میں گھر بیٹھے چھوٹے پیانے کتابوں کا کام کرتے رہے پھر وہ پبلشر یونائیٹڈ کے
نیجر مقرر ہوئے اور اپنے حسن کارکردگی کی بنا پر اس ادارے کی تجارت کو چمکا دیا
اور پھر انہوں نے گوشہ ادب کے نام سے ملک مبارک علی کے تعاون سے اپنا
ادارہ کھولا اور پھر آئینہ ادب تک ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں آپ کا مرغوب
کام "کھانا پینا" ہے اور چنانچہ اسی وجہ سے انہوں ایک "کھنو پارٹی" ترتیب دی
ہے جو ہر وقت رنگ رنگ کی چیزیں کھانے پینے کی فکر میں رہتی ہے یہ ان کے
ساتھ کھنو پارٹی کے دوسرے چند رکن بھی ہیں -

دوسرے اراکین میں یہ ہیں محمد طفیل -------- ادارہ فروغ اردو لاہور
کے مالک اور مشہور رسالے نقوش کے مالک و مدیر -------- ان کی پہچان ان کے
نمایاں کان ہیں اور وہ ان بڑے بڑے کانوں میں کام کی باتیں موتیوں کی طرح
ڈالتے رہتے ہیں اور ان کی زندگی میں عمل کا رنگ بھرتے ہیں شریف فاروق کی
طرح شرمیلے، فارغ کی طرح ڈرپوک اور خاطر کی طرح کمزور ---------

ان کے ساتھ امین کاشمیری صاحب ہیں ہربات پر ضرورت سے زیادہ

کے ---------- مثلاً" جسم میں ------ کھانے پینے میں سب باتوں میں اور ہنسنے
ہنسانے میں -------- اور یہ ہے - سفید ریش بزرگ مولوی ثناء اللہ ہیں - جی ہاں ہنستے
ہوئے سے یہ بزرگ پکے مسلمان ہیں نماز روزہ کے پابند - ان کا اپنا مکتبہ تھا جسے
مادی طور پر ختم کر چکے تھے لیکن روحانی طور پر وہ موجود ہے ان کی بابی مختلف علماء
سے فتوے جمع کرتے رہنا ہے ------ اور یہ ہیں حمید اللہ بھاری بھرکم نیک اور محبت
کرنے والے - لیجئے باتیں ہورہی ہیں اور ایک اور صاحب تشریف لے آتے ہیں
ان کا وطن راولپنڈی کا گاؤں سہام ہے اور ان کا نام ہے - باقی صدیقی ---------
ان کے ساتھ باسط سلیم صدیقی ہے - باقی کی غزل غیر فانی شہرت حاصل کر چکی ہے
باقی کی مختصر سحر آفریں ہلکی پھلکی غزل میں غزل میں زندگی کے بڑے مسائل اس کے
دکھ درد، اس کی شیرینیاں اور اس کی ہلکورے لیتی رنگینیاں ملتی ہیں ------
"دارورسن" اس کی ایسی پیاری غزلوں اور چند نظموں کا مجموعہ ہے ------- باسط
نے ریڈیو ڈراموں اور فیچروں میں خصوصیت حاصل کی ہے --------- اس کے
اسلامی فیچروں کی ایک کتاب "اسلامی ڈرامے" کے نام شائع ہوچکی ہے ---------
ایک کہانیوں کا مجموعہ "بیج" شائع ہوچکا ہے اور ڈرامے آئے دن ریڈیو پر نشر ہوتے
رہتے ہیں -

ابھی ابھی ایک منحنی سا طویل القامت انسان کمرے میں آیا ہے اور مختصر
لوگوں کو سفید کاغذ دے کر ان سے آٹوگراف لے رہا ہے ------ اور اپنے
سوالات کی بوچھاڑ سے انہیں بور کرنے کی کوشش کررہا ہے ان کے سوالات کم
نہیں ہوتے وہ لوگوں سے ذاتی سوالات پوچھنے کے ساتھ ساتھ دو سال بعد امریکہ
سے شاید چھپنے والے انہی آٹوگرافوں کے مجموعے کا نام بھی پوچھ رہا ہے اور جب
لوگوں کی باتوں کا تسلسل ٹوٹے گا - یہ اس خاموشی سے فائدہ اٹھائے گا اور اپنا پرانا
سوال پھر دہرا دے گا ------ یہ انور شبنم دل ہے ------- ایک اور صاحب آتے
ہیں موٹے موٹے شیشوں والے چشموں سے اپنی آنکھوں کو یوں اور زیادہ کھول کر

ادھر ادھر دیکھتے آرہے ہیں جیسے یہ شیشے ایک رکاوٹ بن کر ان کی آنکھوں اور لوگوں کے درمیان حائل ہوگئے ہیں ----- اور وہ ایک ایک سے یوں تپاک سے مل رہے ہیں جیسے وہ ان سب سے بارہ برس کے بعد ملے ہیں -

یہ محمود رضوی ہیں ---------- شہباز کے نیوز ایڈیٹر رہ چکے ہیں فیروز سنز میں منیجر بھی رہے ہیں اور مشہور انگریزی تصنیف آسا ڈوراڈون کن کے مترجم بھی اور رضوی صاحب اچانک خاموش ہوجاتے ہیں اور سر جھکا کر چشموں کے فریم کے اوپر سے اہل محفل کو گھورتے ہیں --------

ابھی ابھی یہاں قدوس صہبائی آئے ہیں یہ وہی قدوس صہبائی ہیں جنہوں نے بمبئی سے ہفت روزہ نظام جاری کیا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ رودادیں شائع کی ہیں پرچہ برصغیر میں مقبول ہوا انہوں نے ناول اور کہانیاں لکھیں لیجئے دروازہ پھر کھلا اب کے جو صاحب آئے ہیں وہ کمبل میں لپٹے ہوئے ہیں، فرنچ کٹ داڑھی، سر پر سیاہ کلاہ لنگی، "السلام و علیکم" انہوں نے آتے ہی سلام داغا ------- ان کے چہرے پر مسکراہٹوں کے گلاب کھلے ہوئے ہیں آنکھیں بھی حسین ہیں اور ماتھے پر شکنیں ابھر آئی ہیں وہ شکنیں جو رنج کا تاثر نہ دیں بلکہ وہ شکنیں جو گہری سوچ اور تفکر نے بنی ہیں وہ شکنیں جو بعض چہروں پر مسکرانے کے سبب سے پڑجاتی ہیں ----- یہ پشتو کے عظیم شاعر امیر حمزہ شنواری ہیں -

سبھی کھڑے ہوگئے ہیں وہ بڑے خلوص اور محبت سے مل رہے ہیں ضیاء صاحب انہیں اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں ان سب نے مل کر ایک تنقیدی نشست میں شرکت کے لئے جانا ہے لیکن ضیاء صاحب کو تصوف کا ایک مسئلہ یاد آجاتا ہے اور وہ امیر حمزہ صاحب کے سامنے وہ نکتہ پیش کرتے ہیں حمزہ صاحب اٹھتے ہیں دروازہ کھول کر ہونٹوں سے نسوار باہر تھوکتے ہیں اور واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہیں اور پھر علم کا دروازہ کھل جاتا ہے تصوف کا شرح و بسط کے ساتھ تجزیہ ہوتا ہے امیر حمزہ پشتو کے ٹپے سناتے ہیں سیدھے سادے دیہاتی ----- پن چکی کے

بارے میں پشتو کے مختصر ترین لوک گیت -----

پن چکی کے پاٹوں میں دانے پس رہے ہیں ایک دانہ لکڑی کی اس کھونٹی سے جا لگتا ہے جس کے گرد اوپر کا پاٹ گھوم رہا ہے گندم پس جاتی ہے لیکن وہ دانہ محفوظ رہتا ہے اس دانے کی مثال اس شخص کی ہے جس نے خداوند قدوس کا سہارا لیا اور وہ طوفانوں کے منہ سے بچ کر محفوظ رہ گیا -

کچھ ایسے ہی اور اشعار اور تصوف کی گتھیاں سلجھتی چلی گئیں -

اتنے میں دروازہ پھر کھلا ------ اور ایک خوبصورت اور روشن چہرہ اندر جھانکا - سفید بال اس چہرے پر اتنے خوبصورت لگتے ہیں کہ جوانوں کا دل بوڑھا ہونے کو چاہتا ہے - یہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی ہیں - اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد ------ جو بعد میں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد اور صدر شعبہ بنے - فاروقی صاحب کو دیکھتے ہی لوگ اسی عزت و احترام سے کھڑے ہوگئے ------ فاروقی صاحب حمزہ صاحب کے پاس بیٹھے اور ضیاء صاحب نے کوچہ رسالدار کے مشاعروں کا ذکر چھیڑ دیا جہاں طاہر فاروقی کے والد گرامی پروفیسر محسن فاروقی آکر شعر پڑھا کرتے ------ وہ شعر پڑھتے ہوئے شعر کی تصویر بن جاتے -------- پشاور والوں نے شعر خوانی کا ڈرامائی انداز انہی میں دیکھا اور یہ انہی کے ساتھ اختتام پذیر ہوگیا -

لیجئے ایک اور بزرگ تشریف لاتے ہیں بڑا نستعلیق انداز ------ سفید فرنچ کٹ داڑھی پگڑی سر پر رکھے، سادہ لباس - یہ ہیں کاکاجی صنوبر حسین - انگریزوں کے دور کے ایک انقلابی جنہوں نے زندگی جلاوطنی میں گزاری - اب اسلم نام سے ایک پشتو کا زبان کا مجلہ شائع کرتے ہیں ان کے جلو میں قلندر مومند ہیں پشتو کے نوجوان شاعر -

لیجئے --------- دروازہ پھر کھلا -------- ایک آواز آئی ------ بھائی کوئی ہے یہ مخصوص آواز ------ پشتو زبان کے ایک اور جید عالم مولانا عبدالقادر

کی ہے - مولانا عبدالقادر کا استقبال بھی اسی احترام اور محبت سے ہوتا ہے وہ بیٹھتے ہیں اور پشتو زبان کی ابتداء اور ارتقا کا ذکر چل پڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا صاحب کلچر پر بھی اپنی سمندر معلومات سے لوگوں کو سیراب کررہے امیر حمزہ شنواری بھی اس معلوماتی ذکر میں شامل ہیں -

ایسی ہی ایک محفل اس دلکش کمرے میں بھی ہو چکی ہے جسے پشاور کا تاریخی کمرہ کہا جاسکتا ہے جی ہاں حاجی کریم بخش سیٹھی مرحوم کا سیٹھیوں کا کوچے کا شاندار محل ---------- آئینہ خانہ ---------- جہاں اس خاندان کے چشم و چراغ یونس سیٹھی نے میزبان کے فرائض انجام دیئے اور یہاں حسین بخش کوثر نے پہلی مرتبہ انکشاف کیا کہ رحمان بابا نے اردو شعر میں طبع آزمائی کی ہے ------

پھر دوست محمد خان کامل نے آتے ہی یہ انکشاف کیا کہ عظیم شاعر خوشحال خان خٹک نے دو تین غزلوں میں اردو کے ٹکڑے استعمال کئے ہیں -

جس طرح پشتو کے ان عظیم شعراء نے اردو میں طبع آزمائی کی ہے اسی طرح آج کے پشتو زبان کے یہ عالم اور شاعر بھی اردو سے اسی طرح محبت کرتے ہیں اور اردو کی تنقیدی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور اس کمرے کی رونق بھی بنتے ہیں ---------- آج ان لوگوں نے یہاں جمع ہو کر شہر کی کسی تنگ و تاریک گلی میں کسی باذوق کے مکان پر انجمن ترقی اردو کے جلسے میں شریک ہونا ہے ------ ابھی کچھ لوگوں کا انتظار ہو رہا ہے -------- دروازہ حسب معمول پھر کھلتا ہے اور دو حضرات کمرے میں داخل ہوتے ہیں -------- کمرے میں ایک لمحے کے لئے شور سا مچ جاتا ہے -

"آیئے زار صاحب" -------- فارغ کہتا ہے -

اور پروفیسر نصیر احمد زار صاحب آجاتے ہیں -

"آؤ حفیظ بھیا" -------- رضا ہمدانی دوسرے صاحب کے لئے جگہ چھوڑتے ہیں اور پروفیسر زار حفیظ اثر کی طرف غور سے دیکھتے ہیں "ان سے ملاقات

نہیں" رضا ہمدانی پوچھتے ہیں زار صاحب لاعلمی ظاہر کرتے ہیں -

"آپ حفیظ اثر ہیں" رضا ان کا تعارف کراتا ہے زار صاحب کہتے ہیں "میرے جانتے یہ نام اکثر سنا ہے"

"آپ کی تعریف" حفیظ پوچھتے ہیں

"آپ نصیر احمد زار ہیں" ایڈورڈ کالج میں پشاور میں پروفیسر رہ چکے ہیں پروفیسر طاہر فاروقی کے بعد ریڈیو سے سننے والوں کو اردو بھی سکھاتے رہے آج کل گورنمنٹ کالج ڈیرہ اسماعیل میں اردو کے استاد ہیں بڑی اچھی نثر لکھتے ہیں اور بڑی پیاری غزلیں - بڑے منجھے ہوئے نقاد ہیں اور آج آپ کو انجمن کی نشست میں معلوم ہو جائے گا کہ ادب کے ہر شعبے پر کس بے تکلفی سے تنقید کرتے چلے جائیں گے ------- "آپ صرف پروفیسر نصیر احمد زار ہی نہیں حلقہ ارباب ذوق بھی ہیں اور پشاور میں آپ ہی کے دم سے حلقہ ارباب ذوق ترقی پذیر ہے - انتخاب میر بھی مرتب کر چکے ہیں -

پروفیسر صاحب حفیظ اثر پہلے اردو سبھا تھے اور اردو مرکز ہیں ستھری غزلیں اور نظمیں کہتے ہیں آپ کا مرغوب مشغلہ کل ہند اور کل پاکستان مشاعرے کرانا ہے بڑے نیک اور خاموش طبیعت کے مالک ہیں" --------

"خوب" زار صاحب آنکھوں میں پتلیاں گھماتے ہوئے کہتے ہیں ----

دروازہ پھر کھلتا ہے اور فرید عرش اور منظور ملک داخل ہوتے ہیں اور ایک ایک کر کے سب سے مصافحہ کرتے ہیں -

عرش صاحب آئندہ کسی نشست کے لئے افسانہ تیار رکھئے - خاطر کہتا ہے اور پھر زار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے -

"زار صاحب، عرش صاحب غزل اور نظم کے علاوہ افسانہ بھی لکھتے ہیں اور ان میں افسانہ لکھنے کی بڑی صلاحیتیں ہیں لیکن ایک مصیبت یہ ہے کہ افسانوں اور غزلوں کی طرف توجہ ذرا کم دیتے ہیں اور ہر وقت تجارت کی بھول بھلیوں میں

گم رہتے ہیں" مجید شاہد ان کے ساتھی ہیں ان کی غزلوں میں بلا کی گھلاوٹ ، مضمون آفرینی اور دل کشی ہے اور وہ اس صنف میں بہت آگے بڑھ چکے تھے لیکن انہیں بھی تجارت لے ڈوبی وہ کوئٹہ گئے جہاں انہیں ادبی صحبتیں میسر نہیں آئیں اور اس لئے وہ وہاں سے بھی ہجرت کر کے کراچی پہنچے - لیکن وہاں کی مشینی زندگی بھی کوئٹہ کی مرغزاروں کی فضا بن نہ پائی لیکن اس کے باوجود شاہد جو غزلیں کہہ چکا ہے وہ اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں - مجید شاہد کے مجموعہ کلام "اڑان" اور "دشت جاں" کے نام سے چھپ چکے ہیں -

دروازہ پھر کھلتا ہے اور ایک لمبا تڑنگا اور خوبصورت نوجوان داخل ہوتا ہے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے اور مسکراہٹ میں شرارت بھی جھلک رہی ہے - ضیاء صاحب اسے دیکھ کر شرما سے گئے ہیں ' ------- سب ایک پر معنی ہنسی ہنستے ہیں - رضا آنے والے کا خیر مقدم کرتا ہے "آؤ آغا" ------ اور آغا اندر آجاتا ہے -

"زار صاحب ان سے ملئے" ------

اور زار صاحب ان سے ملتے ہیں --------

یہ اختر جعفری ہیں اور ضیاء صاحب کے نور چشمی

لیکن ان کی پہچان محض یہی نہیں ------ یہ نوجوان خوبصورت غزلیں اور نظمیں اور افسانے بھی لکھتا ہے -

زار صاحب مرعوب ہوتے جارہے ہیں --------- اچانک دروازہ بڑی آہستگی سے کھلتا ہے اور ایک صاحب موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے ہیں

"اور تقریباً" سبھی آشنا صورتیں "لالہ" "لالہ" کہتے آنے والے کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں --------

زار صاحب حیران پریشان دیکھ رہے ہیں ------ اور سوچ رہے کہ الٰہی یہ

کیسا لالہ ہے -

"لالہ صحرائی" یا "لالہ پشاوری" -------- اور ان کی ذہنی کشمکش کو مرزا نذیر برلاس دور کر دیتے ہیں --------

"زار صاحب ------ یہ مضطر تاتاری ہیں ------- سرحد کے امی شاعر انہوں نے ایسی پیاری اردو نظمیں کہی ہیں کہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ایک امی شاعر کے اشعار ہیں ان کی نظمیں شوکت الفاظ ، حسین ترکیبوں اور نئے موضوعات سے مالا مال ہوتی ہیں اور یہ صرف اردو ہی نہیں ہندکو میں بھی بلا کی شاعری کرتے ہیں"

یہ کمرہ جو دائرہ ادبیہ ہے بزم سخن ہے انجمن ترقی اردو ہے ادبستان ہے انجمن ترقی پسند مصنفین ہے -------- اردو سبھا ہے ، اردو مرکز ہے اور بزم علم و فن بھی ہے جسے ایبٹ آباد سے تاریخ کے استاد شوکت واسطی نے پشاور در آمد کیا - بزم علم و فن کی صورت میں یہ کمرہ چوہدری محمد علی ایڈووکیٹ جنرل (اور بعد میں وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی) کے دولت کدے پر کئی مرتبہ گیا جہاں ادبی محفلوں کے ساتھ برصغیر کی مشہور فلمی شخصیت جنیت (ذکریا خان) نے شرکت کی جو اپنے دونوں بیٹوں امجد خان اور مرتضیٰ کے ساتھ بمبئی سے اپنے عزیزوں سے ملنے آتے ہیں پھر یہ کمرہ پشاور کے کمشنر عطاء اللہ جان مرحوم کے ہاں پہنچتا ہے ، پھر میاں مشتاق احمد ڈائریکٹر تعلیمات اس کمرے کو شاہی مہمان خانے پہنچا دیتے ہیں ، ضمیر جعفری ، مرزا محمود سرحدی اور شیخ نذیر احمد جیسے مزاح نگاروں کی زندہ تخلیقات نے اس کمرے کی آبرو بڑھائی پروفیسر محمد طاہر فاروقی کی تحقیق نے اسے گہرائی بخشی ، مسعود قریشی ، ادیب سہارنپوری ، عطا حسین کلیم ، حمید نسیم ، حامد عزیز مدنی ، شاوا امرتسری ، اختر شیرانی ، ، خمار بارہ بنکوی ، سیماب اکبر آبادی ، حسرت موہانی ، مصطفیٰ زیدی ، قاری علی تجمل امروہوی ، سید محمد جعفری ، قمر جلالوی ، فیض احمد فیض ، اقبال صفی پوری ، عارف عبدالمتین ، ڈاکٹر وزیر آغا ، مختار صدیقی قیوم نظر ، قتیل شفائی ، جمیل ملک ، احمد ظفر ، منظور عارف ، عبدالحمید عدم ، احسان دانش ، حاجی لق لق ،

جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، ایس ایس نیازی، چراغ حسن حسرت، سیف
الدین سیف، سید مقصود زاہدی، محبوب اختر، یوسف ظفر، عابد علی عابد، صادق نسیم
نے اسے اپنے نغموں سے معمور کیا سعادت حسن منٹو، حفیظ جاوید، سید انصار
ناصری، ڈاکٹر افضل اقبال، نصر اللہ عزیز، نصیر انور، محمود نظامی، محمد موسیٰ کلیم،
ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، حمید احمد
خاں، شاہد احمد دہلوی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، رفیع پیرزادہ نے اس کمرے کو
اپنی تخلیقات سے نوازا اور پھر رات کا جادو ہمہ گیر ہوتا جاتا ہے اور قصہ چار
درویش کی کہانی والا ہنگام آجاتا ہے جبکہ قلعہ کی دیوار سے ایک بند صندوق آہستہ
آہستہ نیچے اترتا ہے یہ لوگ آہستہ آہستہ اٹھنے لگتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کا
راستہ لیتے ہیں اور آخر میں صرف فارغ اور رضا رہ جاتے ہیں اور پھر وہ مل جل
کر منقل اور کمبل اور دوسری چیزیں سمیٹنا شروع کردیتے ہیں تاکہ اوپر لے جائیں
اور پھر دوسرے دن شام پڑتے ہی نئے سرے سے اس کمرے میں رونق آنی شروع
ہوجاتی ہے فارغ اور رضا بیٹھے ہیں مصطفیٰ ریڈیو کی تابوں کے درپے ہیں اور
انگیٹھی روشن ہے نذیر مرزا برلاس صاحب آجاتے ہیں - مٹیالا دو شالہ اوڑھا ہوا
ہے اور سگریٹ ہونٹوں میں تھما ہوا ہے وہ اپنی جگہ بیٹھنے ہی پاتے ہیں کہ اتنے میں
باہر سائیکل رکھنے کی آواز آتی ہے "خاطر آیا ہے" ------- رضا کہتا ہے کہ
جھپاک سے دروازہ کھلتا ہے اور فراز داخل ہوتا ہے ------- پھر سائیکل کی
آواز آتی ہے اب کے خاطر ہے کمرے میں پھر سے قہقہے گونجنے لگتے ہیں - باہر کا
دروازہ کھلتا ہے --- اور پھر بند ہونے کی آواز آتی ہے ------ کمرے کا
دروازہ کھلتا ہے سب کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی ہیں ------ ضیاء صاحب
ہیں ------ تشریف لائیے - ضیا صاحب پیچھے مڑ کر کہتے ہیں اور ایک بزرگ اچکن
زیب تن کئے سر پر دو پلی ٹوپی جمائے داخل ہوتے ہیں صحت مند جسم لیکن چہرے پر
اضمحلال ------ کھچڑی سی مختصر سی داڑھی، آنکھوں میں زندگی کی حرارت

------- آپ خالد صاحب ہیں رام پور کے رہنے والے - ضیا صاحب تعارف
کراتے ہیں ان کو اکثر دل کے دورے پڑتے ہیں اور دل کے دورے کا نام سن کر
مہمان کو جیسے بھولی ہوئی بات یاد آجاتی ہے اور وہ اپنا ہاتھ دل پر رکھ لیتے ہیں
------- آپ رام پور کے ایک روہیلہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں رام پور کی
اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں اخبار نویسی کر چکے ہیں ---------- جوش ملیح آبادی اور
فراق اور حسرت موہانی اور روش اور مجاز اور وغیرہ وغیرہ کی صحبتیں دیکھ چکے ہیں
ہندوستان سے ہجرت کرکے مشرقی پاکستان گئے لیکن وہاں دل نہ لگا سرحد سے پناہ
محبت ہے اور اس لئے پشاور کو اپنانے کے لئے یہاں لے آئے -

دروازہ پھر کھلتا ہے اور احسان اور رجا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کمرے میں
داخل ہوتے ہیں -------- لیجئے خالد صاحب ان سے ملئے ------- "یہ محسن
احسان ہیں" ضیاء جعفری صاحب ابھی تک تعارف کے موڈ ہیں ------ ہمارے
نوجوان اور ہونہار شاعر ------ یہی وہ شاعر ہے جسے اس کے صرف ایک شعر نے
اسے زندہ کردیا ہے -

یہ ایبٹ آباد میں سرکاری ملازم ہیں ماں باپ سے دور ہے، دوستوں سے
دور ہے ----- اور وہاں کی نم دار لجلجاتی راتوں میں ماں باپ اور دوستوں کو یاد
کرکے روتا رہتا ہے لیکن مجبور ہے ملازمت چھوڑے تو بھوکا مرتا ہے ----- اس
لئے یہ دل پر جبر کئے ہوئے ہے اور سب سے دور رہنے پر رضا مند ہوگیا ہے لیکن
اسے اس کمرے سے محبت ہے اس کمرے کی زندگی بخش حرارتوں سے عشق ہے
اور اسے اگر آدھے دن کی چھٹی ملتی ہے تو یہ اڑ کر یہاں پہنچ جاتا ہے ----- خالد
صاحب سر ہلا کر خاموش داد دے رہے ہیں اور ضیاء صاحب کہتے جارہے ہیں -

"خالد صاحب یہ برخوردار یوسف رجا ہے اور ایک چھوٹے سے گاؤں
بدھائی کا رہنے والا ہے اس نے عربی فارسی اور اردو کی تعلیم پر خاص توجہ دی اور
جب اسکول سے نکلا تو کسی مسجد میں مولوی بننے کے بجائے ایک دفتر میں کلرک بن

گیا کیونکہ مولویت اس کی نس نس میں رچی ہوئی ہے اس لئے اپنے دوستوں کو عربی میں خط لکھ کر دل کی بھڑاس نکالتا ہے یا پھر کتابوں اور دوستوں کی بیاضوں پر حاشیے چڑھا دیتا ہے یہ برخوردار بڑا باہمت اور پرعزم ہے اس نے ترقی کی امنگوں کو دل میں مچلنے نہیں دیا بلکہ ان امنگوں کی بنیاد پر زندگی کی ایک عظیم عمارت کھڑی کرنے کا ارادہ کیا اس نے دفتر کی کلرکی چھوڑ دی اور اپنے عزم کے بل بوتے پر اب ایک فوجی افسر بن گیا ہے ---- خدا اسے اپنے وطن کی صحیح معنوں میں حفاظت اور خدمت کرنے کی توفیق بخشے -------

ضیاء صاحب دینیات کی گھنٹی بجنے لگی ۔ یہ شاید -------- محسن احسان بولتا ہے ایک قہقہہ چھوٹتا ہے ---------- اور ضیا صاحب احمد فراز کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور اسے خالد صاحب کی طرف کھینچتے ہیں ------ ضیاء صاحب منہ سے تعارف کرائیے ۔ ہاتھوں سے نہیں -------- اور ضیا صاحب فراز کا ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ احمد فراز ہے ---------- سرحد کی جدید ترین ادبی پود میں نمایاں تر اور ہونہار ترین شاعر -------- میں اس برخوردار کا اس سے زیادہ مختصر اور اس سے زیادہ مفصل تعارف نہیں کرا سکتا ۔

ضیاء صاحب خدا کے لئے اب تعارفوں کا سلسلہ ختم کیجئے جو تھوڑا بہت رہ گیا ہے وہ آئندہ کے لئے اٹھا رکھیئے ------ فارغ چلاتا ہے اور ضیاء صاحب تعارفی سلسلہ ختم کر دیتے ہیں ---------

اور پھر ایک خدا رسیدہ درویش کا واقعہ سنانا شروع کر دیتے ہیں جو بارہا سنا چکے ہیں فارغ چلاتا ہے ضیا صاحب یہ کہانی ہم نے سو بار سنی ہوئی ہے کوئی نئی بات سنائیے ۔ "نہیں بھائی ! میں نے نہیں سنی اس لئے میری خاطر ایک بار سن لیجئے" خالد صاحب سفارش کرتے ہیں اور ضیا صاحب جمال میاں سے لے کر جلال بابا تک سبھی درویشوں کی کرامتوں اور قوتوں کے واقعات سنا دیتے ہیں اور ان کے چہرے پر ایک ہنستی ہوئی تعظیم اور تکریم کھیلنے لگتی ہے ان کی آنکھوں میں ان جانی سی

شعلیں روشن ہو جاتی ہیں جیسے جمال میاں سے جلال بابا تک سبھی ان کے سامنے بیٹھے ہیں اور پھر وہ پھلور پہنچ جاتے ہیں جہاں انہیں درویشوں کی پشت پناہی کے سبب پولیس کی غیر درویشانہ اور غیر شاعرانہ پریڈوں سے نجات ملی ۔

"بس ضیا صاحب یہی آپ کی ہمت تھی کہ تھانیداری سے بھاگ آئے آپ" احسان طعنہ دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں ایک اور ہنستا ہوا چہرہ جھانکتا ہے اور کمرے میں جیسے زندگی دوڑ جاتی ہے اور اس ہنگامہ خیز استقبال کا جواب اپنی دلکش ہنسی سے دیتا ہوا مہر دل درانی کمرے میں داخل ہوتا ہے ۔

"خالد صاحب یہی وہ برخوردار ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے بڑا نیک بچہ ہے ---------" اور نیک بچہ ضیا صاحب کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے "یہ رشتے میں میرا خالہ زاد بھائی ہے" اور خالہ زاد بھائی اپنے چہرے کی رعنائیوں میں ایک شریر مسکراہٹ کا اضافہ کر کے سب کی طرف دیکھتا ہے جیسے کسی کفر کا مرتکب ہو رہا ہے -------

اور محفل میں پھر سے قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں اور باتوں میں داستانیں جھانکنے لگتی ہیں اور داستانوں میں دس یا ساڑھے دس بج جاتے ہیں دروازہ پھر کھلتا ہے اور سیاہ کمبل میں لپٹا لپٹایا مسعود انور شفقی داخل ہوتا ہے اس کے ہونٹوں میں بیک وقت دو چیزیں ہیں ------ شوخ مسکراہٹ اور دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا سگریٹ ------ شفقی کے پیچھے فتح ہے --------

"ارے تمہاری پھر صلح ہو گئی ---- بیک وقت چار پانچ آوازیں شفقی پر برستی ہیں اور وہ مسکراتا ہوا بغیر کوئی جواب دیئے کمرے کے شمال مغربی کونے میں جا دھنستا ہے --------- اور فتح اس کی پیروی کرتا ہے ------

"خالد صاحب یہ شفقی ہے نا" وہ خالد صاحب کو یوں یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے شفقی خالد صاحب کے ہاتھوں میں پلا ہو اور خالد صاحب ہنس رہے ہیں اور سر ہلا رہے ہیں کبھی شفقی کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی ضیا صاحب کی طرف

خالد صاحب شفقی نئے لکھنے والوں میں بڑا ہونہار غزل گو ہے ------- لیکن اس کی ایک بری عادت ہے کہ یہ رات کو دس یا گیارہ بجے گھر سے نکلتا ہے اس لئے یہاں بھی روزانہ دیر سے آتا ہے --------

"ضیا صاحب میں ہوٹل میں قہوہ پیا کرتا ہوں -------" شفقی صفائی پیش کرتا ہے ------- قہوہ دن میں نہیں ملتا -------- خاطر فقرہ کستا ہے۔

فراز آج تم کالج نہیں گئے ------ ایک سوال ابھرتا ہے ------ آج بس چھوٹ گئی ----- اس لئے شہر ہی میں رہوں گا --------

اور پھر آہستہ آہ کا جادو ہمہ گیر ہونے لگتا ہے اور آخر قصہ چہار درویش کی اس کہانی کا ہنگام پھر سے آجاتا ہے جبکہ قلعہ کی دیوار سے ایک بند صندوق آہستہ آہستہ نیچے اترتا ہے اور سبھی احباب اٹھنا شروع ہوجاتے ہیں دوسری جنگ عظیم کا زمانہ ہے اکثر راتوں کو بلیک آؤٹ ہوجاتا ہے ضیاء صاحب اس قافلے کے سالار کی حیثیت سے ان کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ پہلے وہ کوچہ رسالدار کی سواریوں کو گھر تک پہنچاتے ہیں کوچہ رسالدار سے واپسی کے وقت وہ اندھیری بساط میں اچانک زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور زمین پر دو ہتڑ مار کر کہتے ہیں "میں بلا ہوں، مجھ سے بچ کر تم لوگ کہاں جاؤ گے" فارغ بخاری اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہتا ہے "ضیاء صاحب خدا کے لئے آدمی بن جایئے ہمارے ساتھ انگریزوں کا سا وطیرہ اختیار کیا تو ہم جلوس نکال کر قصہ خوانی کی طرف بڑھیں گے کہ انگریز تو بلیک آؤٹ کررہا ہے اور ضیاء صاحب بلیک میل کررہے ہیں۔" اندھیرے میں قہقہے روشنیاں بکھیر دیتے ہیں اور ضیاء صاحب ایک ایک کو ان کے گھر پہنچا کر پھر اپنے گھر لوٹتے ہیں۔ جب وہ گھر پہنچتے ہیں تو آدھی رات کا ہنگام برقرار ہوتا ہے اور فصیل شہر سے کوئی صندوق نہیں اترتا بلکہ ان کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے اور ضیاء صاحب اپنے اپنے گھر کی طویل بساط میں داخل ہوجاتے ہیں یہ

بساط کوچہ رسالدار سے بھی زیادہ تاریک ہے لیکن ضیاء صاحب کی اندر کی روشنی ان کے سارے راستوں کو بقعہ نور بنا دیتی ہے۔

ایک جدید کمرہ

پشاور آپے میں نہیں سمایا، دیہات کی آبادی بھی پشاور میں ہجرت کر آئی ہے۔ پشاور کی فصیل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے، اصل فصیل کا ایک ٹکڑا کوہاٹی دروازے اور دوسرا سرد چاہ دروازے کے آس پاس کہیں نظر آ جاتا ہے۔ ایک مصنوعی فصیل جو سکندر پورہ کو جی ٹی روڈ سے جدا کرتی ہے اور اس کی حفاظت کرتی ہے انگریزوں نے اپنے آخری دور میں سکندر مرزا کی پشاور کی ڈپٹی کمشنری کے زمانے میں بنا کر اس کے اندر کی نئی آبادی کو محفوظ کرنے کی کوشش کی اس کے بعض اب اہل ثروت اور اہل زور وزر والوں نے گرا دیئے، غریب غرباء کے مکانوں کو ابھی کھلی ہوا لگنے کی اجازت بھی نہیں۔

تو پشاور کی اصل فصیل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ آبادی بڑھ کر نام نہاد فصیل سے باہر اُمڈ آئی ہے۔ پشاور پھیل گیا ہے نجانے اب کتنے اضلاع میں تقسیم ہو جائے۔ فاصلے بڑھ گئے ہیں پہلے لوگ ہشتنگری سے چل کر قصہ خوانی میں دائرہ ادبیہ میں اور اس کے بعد محلّہ خداداد میں فارغ رضا کے گھر پہنچ جاتے تھے اور وہ جو ایک زمانے میں ڈولیوں میں عورتیں سفر کرتی تھیں آج کل ڈولیوں کی جگہ رکشہ نے لے لی ہے۔ اب لوگ ہشتنگری سے میونسپل کارپوریشن بھی جانا چاہیں تو رکشہ والی ڈولی میں سفر کرتے ہیں۔ پیدل چلنے کی رسم ختم ہوتی جا رہی ہے اور اس لئے شوگر کا مرض عام ہوتا جا رہا ہے۔ پروفیسر طہٰ خان شوگر کا علاج جامن کے درخت کی چھال بتاتے تھے۔ لیکن جب لبلبہ ہی مر جائے تو کسی درخت کی چھال کام نہیں آتی۔

پشاور یونیورسٹی کے قیام نے صدر کی حدود کو پھاند کر شاہین ٹاؤن، یونیورسٹی ٹاؤن، غریب آباد، سیکنڈری بورڈ اور حیات آباد تک اپنی دھول پھیلا دی ہے، اسلامیہ کالج اور پشاور

یونیورسٹی نے جو علم وادب کا چراغ جلایا تھا۔ اس کی روشنی سے کئی چراغ جلے۔ مولانا عبدالقادر، فضل حق شیدا، عبدالاکبر خان اکبر، شوکت اللہ خان اکبر، سید رسول رسا، اشرف مفتون، غنی خان، فرید اللہ شاہ، مسعود کوثر اور میجر یونس خلیل جیسے اہل قلم اور کئی نابغہ روزگار اس مادر علمی نے پیدا کئے۔

یونیورسٹی کے قیام کے بعد شعبہ اردو، فارسی، میڈیکل کالج، شعبہ فلسفہ، شعبہ صحافت، شعبہ پشتو، پشتو اکیڈمی نے بہت سے نامور اہل قلم کو جنم دیا۔ ان میں جنہوں نے نام پیدا کئے ان میں احمد فراز، محسن احسان، پروفیسر پریشان خٹک، پروفیسر پوردل خٹک، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، اباسین یوسفزئی، داور خان داؤد، پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، حنیف خلیل اور سلمہ شاہین وغیرہ شامل ہیں۔ پہلے پہل شعبہ اردو سے بعض اہل قلم سامنے آئے۔ شعبہ اردو اور پشتو ڈیپارٹمنٹ اور اکیڈمی کے عملے کے ادب دوست لوگوں نے عظیم مشاعرے منعقد کئے، ادبی محفلیں برپا کیں، ادبی جلسے اور سیمینار منعقد کئے، کانفرنسیں کیں اور کیمپس کے ادب سے محبت کرنے والے سامنے آئے۔

پھر یونیورسٹی کے نوجوانوں نے ایک ادبی انجمن بنائی جس کا نام ینگ رائٹرز فورم رکھا جو بعد میں حلقہ فکر ونظر کے نام سے ایک فعال انجمن بنی۔ اس انجمن نے ٹیچر سٹوڈنٹس سنٹر میں ادبی کمرہ کھولا۔ اس فورم کے تحت ناصر علی سید صدر چنا گیا جب کہ مشتاق شباب سیکرٹری بنا۔ اس کے بعد نذیر تبسم سیکرٹری ہوا۔ جو اس انجمن میں شعر وافسانہ ومقالے اور مشاعرے، ڈرامے اور افسانے پڑھتے ان میں صابر کلوروی (اب ادبی ڈاکٹر)، قاضی فصیح الدین (اب میڈیکل ڈاکٹر)، جناب عاصم صباحت (اب میڈیکل ڈاکٹر اور صاحب کتاب)، ڈینس آئزک (میڈیکل ڈاکٹر)، خاور احمد، طارق احد، عزیز اعجاز، رئیس بیگ، عنایت اللہ شاہد، ڈاکٹر بشارت، عبدالوحید آفندی، داؤد عابد، اشرف عدیل (اب فلسفے کے ڈاکٹر) اور ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر ایوب خاور اور اسلم طاہر کے علاوہ لیاقت عدیل بھی حصہ لیتے رہے اور اپنی نئی

سوچ اور دنیا کے نئے تقاضوں کی ترجمانی سامنے لائے۔ یہ نیا گروہ ترقی پسندی کا ایک نیا روپ تھا۔ اپنے معاشرے پر نظر رکھنا آگے بڑھنے کی امنگ لے کر معاشرے کی برائیوں پر تنقید کرنا ان نوجوانوں کا وطیرہ ٹھہرا۔ بعد میں یہ لوگ اچھے غزل گو، اچھے نظم نگار، اچھے افسانہ نگار، اور اچھے ڈرامہ نگار ثابت ہوئے اور ملک میں نام کمایا۔

انہوں نے میڈیا کے بھی گوشوں میں اپنی صلاحیتوں کا جادو جگایا۔ اسی زمانے میں ان نوجوانوں کا ذوق شوق، ان کا معیار ادب اور ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر راقم نے اپنے ماہنامے "احساس" کا نوجوان نسل کے حوالے سے ایک خاص نمبر شائع کیا اور پھر اسے کتابی صورت میں "نومیدہ" کے نام سے شائع کیا۔ آج یہی سب کے سب نوجوان اہل قلم پشاور کی نئی پود کے طور پر سارے ملک کے ادبی منظر کا حصہ ہیں اور جدید ترین پود میں سینئر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق جو پروفیسر نصیر احمد زار نے شروع کیا سرکاری زینی جارچوی اور افضل امر نے اسے پر بخشے اور ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں باقاعدہ ادبی اور تنقیدی جلسے ہونے لگے ان میں یوسف رجا چشتی بھی تھے جو اپنے فوجی ملازمت کے سلسلے میں پشاور چھوڑ کر بحکم سرکار شہر شہر بندوق اور پیچ کش لئے گھومتے رہے۔

یہاں کبھی حلقہ ٹوٹ جاتا، کبھی پھر سے زندہ ہو جاتا، یہ آنکھ مچولی حلقے کی قسمت میں رہی اب کے حلقہ ناصر علی سید، نذیر تبسم، سجاد بابر، منظر نقوی، یوسف عزیز زاہد، لیاقت علی کے پرجوش ہونے پر پھر فعال ہو گیا ہے اور اب ہر جمعرات کی شام پریس کلب اور فورورڈ کالج میں حلقہ کے تنقیدی اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ پریس کلب کی نئی عمارت کی تعمیر کے بعد اب حلقہ مرکزی اردو بورڈ میں منتقل ہو گیا ہے۔ حلقے کی روایت کے مطابق جو شخص نظم یا نثر پڑھتا ہے اس کے منہ پر پٹی باندھی جاتی ہے اور وہ پٹی کے پیچھے اپنے آپ پر تنقید سن کر کڑھتا رہتا ہے اور جواب دینے سے معذور قرار پاتا ہے۔

یہ حلقے کے کمرے والے اب اکٹھے کوہاٹ جا کر محمد جان عاطف اور شاہد زمان کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور کوہاٹی کمرے کو زندگی بخشتے ہیں۔ یوں بھی ماضی میں پشاور کے شعراء نے کوہاٹ کو دوسرا پشاور سمجھا۔ اسی طرح یہ گروہ ایبٹ آباد … رن ایج کالج اور دوسرے مقامات پر عامر سہیل اور بشیر سوز اور سید واجد رضوی کے ساتھ ساتھ پروفیسر ایوب صابر' سلطان سکون' یونس شاہ کی گفتگو سنتے ہیں۔

خاطر غزنوی سنڈیکیٹ آف رائٹرز کے تحت باقاعدگی سے ہر مہینے کے پہلے جمعے کو اپنی رہائش گاہ پر جلسے منعقد کرتا ہے اور یہاں پشاور کے سبھی لوگ شرکت کرتے ہیں کبھی کبھار باہر کے مہمان بھی آ کر ان اجلاسوں کی رونق بڑھاتے ہیں گویا ایک کمرہ زندہ ہے اور گردش میں ہے۔

سنڈیکیٹ آف رائٹرز "فارغرضا" کی بیٹھک کی طرح کا مقام ہے' گلبہار میں سانسیں لے رہا ہے اور نوجوانوں کی سرپرستی اور ان کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔

سنڈیکیٹ آف رائٹرز کے پڑوس میں ناز سیٹھی کی ادبی محفل ہر ماہ کے تیسرے اتوار کو برپا ہوتی ہے اس محفل کا خاصہ یہ ہے کہ یہاں نئے اور پرانے شعرا کی مشاعرے کی محفل جمتی ہے یہاں ہر عمر اور ہر قد کا شاعر آتا ہے۔ ہر رنگ اور تقطیع کا صاحب قلم اپنی غزلیں یوں ساتھ لاتا ہے جیسے جلیبیاں' بھول بھلیاں جلیبیاں لیکن میٹھی۔ ہر زبان کی شاعری سننے میں آتی ہے' پشتو' فارسی' اردو' ہندکو غزلوں کا دھواں بعض اوقات آنکھوں میں تلخ آنسو بھر دیتا ہے وزن کی کوئی قید نہیں یعنی یہاں قافیہ تنگ نہیں ہوتا' بعض اوقات ہارمونیم کے ساتھ بھی غزل سرائی ہوتی ہے۔

یہ ایک کمرہ ہے جہاں ایک نئی پود جنم لے رہی ہے جس میں سے ہر ایک نے آگے جا کر صاحب کتاب ہونے کا شرف حاصل کرنے کی ٹھانی ہے' اس کمرے میں صاحب طرز شعرا کی بیٹھک ہونے کا شرف حاصل کر لیا ہے۔ ان مشرف لوگوں میں امجد بہزاد' حسام حر' اظہار

اللہ اظہار' زیتون بانو' ثریا حسام' نرجس افروز زیدی' قدسیہ قدسی' بشریٰ فرخ اور اقبال قابل ذکر ہیں۔

پنجاب سے منظر نقوی نے پشاور آ کر گھر خرید لیا ہے اور اب وہ مکمل پشاور کا ہو گیا ہے۔ اکمل نعیم بھی پنجاب ہی سے آیا بلکہ یوں کہیے کہ اس نے بھیرے سے آ کر شمیم بھیروی کی جگہ لے لی ہے۔ وہ اب بھی پشاور میں مکان خرید کر زندگی کو پشاوری بنانے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ لیکن دست شناسی کے مرض نے اس کو گوشہ گیری پر مجبور کر دیا ہے۔ یعنی جب سورج غروب ہونے لگتا ہے اس کی دکان بھی لگتی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مردوں کی دیکھا دیکھی سرحد کی خواتین کو ادبی دنیا میں اپنا مقام حاصل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اپنی خواتین کی ادبی انجمن "وویمن رائٹرز فورم" کا ڈھول ڈالا اور کئی مشاعرے اور جلسے برپا کئے۔ اب خواتین میں ذوق بڑھتا جا رہا ہے اور ان خواتین کی صدر پشتو کی مایہ ناز افسانہ نگار زیتون بانو رہی ہے۔ اور سیکرٹری بشریٰ اقبال ہے اب یوں کہیے کہ انہوں نے اپنا ایک کمرہ بلکہ ایک چاردیواری تعمیر کر لی ہے جہاں مردوں کے داخلے پر پابندی نہیں ہے یہ ادبی کمرہ دوسری خواتین کو بھی متعارف کرا رہا ہے۔ ان دوسری اہل قلم خواتین میں قدسیہ قدسی' فرحانہ علی' بشریٰ اقبال' بشریٰ فرخ' شمشاد نازلی' انیلا شاہین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اور ادبی ذوق رکھنے والی طالبات اور خواتین اس چاردیواری میں کھچی چلی آ رہی ہیں

ان متذکرہ کمروں کے بعض دوسرے نئے پرانے اہم لوگ یہ ہیں۔ جناب شریف فاروق جو ایک کمرے یعنی دائرہ ادبیہ کے دور سے ادبی انجمنوں کا ساتھ دے رہے ہیں جنہوں نے سرحد کے پہلے جدید ترین اخبار "شہباز" میں ادب و شعر کیلئے اپنا کالم وقف کر رکھا تھا۔ پروفیسر طہ خان' ڈاکٹر ظہور اعوان' اشرف بخاری' بیگم سلمیٰ علی خان' پروفیسر منور روف صاحب' پروفیسر عبدالغفور' پروفیسر بیگم وحیدہ غفور' منور ہاشمی' ڈاکٹر صدیق شبلی' ڈاکٹر صباحت عاصم' افتخار عارف' سید ضمیر جعفری' پروفیسر انور مسعود' سرفراز شاہد' ڈاکٹر انعام الحق جاوید' نیاز سواتی' بیگم

ثاقبہ رحیم الدین، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، اباسین یوسفزئی، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک، سلمیٰ شاہین، لیفٹیننٹ جنرل محمد عارف بنگش (سابق گورنر صوبہ سرحد)، شاہدہ سردار، عدیم ہاشمی، جوہر میر، ڈاکٹر امجد حسین، ڈاکٹر جمیل جالبی، طارق ہاشمی، ساحر مصطفائی، نوید تاتاری، سید ارشاد الحسن، استاد بشیر صوفی، سہیل انجم، خالد سہیل ملک، سہیل احمد، لیاقت علی، عبداللہ وداد، نشاط سرحدی، سردار خان فنا، گوہر حمان نوید، شہاب صفدر، جواد، پروفیسر رفیق ان کمروں کی سرپرستی کرتے ہیں، پشاور کے باہر کے شعراء وادبائے کرام بھی آتے رہے جن میں جناب احمد ندیم قاسمی، پروفیسر شوکت واسطی، جناب جلیل عالی، حمید شاہد، پروفیسر احسان اکبر، غضنفر عاشمی، مشہور شعراء میں احمد فراز بھی وقتاً فوقتاً نئے کمروں کی سیر کرتے رہتے ہیں۔

تو یہ ہے نوجوانوں کا جدید کمرہ، ایک کمرہ، ایک تحریک، ایک تاریخ، اس کمرے کی ایک اور صورت اباسین آرٹس کونسل ہے۔ جو فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتی ہے۔ ادبی محفلیں برپا کرتی ہیں اور ادبی کتب پر انعامات تقسیم کرتی ہیں۔ ان انعامات میں خیبر بینک کا بھی حصہ ہے وہ اباسین کی وساطت سے ہر سال فنون کے شعبے میں چار انعامات یعنی ساڑھے بارہ ہزار روپیہ ہر انعام یافتہ کو دیتی ہے، فنون میں ادب، ڈرامہ، موسیقی اور مصوری شامل ہے۔ پہلے پچیس ہزار کے دو انعامات تھے، اب ساڑھے بارہ ہزار کے چار انعامات۔ لیکن انعام کی رقم پچاس ہزار سے تجاوز نہ ہو سکی۔ یہ بھی بینک کی فراخ دلی ہے اور ہم خیبر بینک کو اس فراخدلی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

سرحد کی ادبی انجمنیں

برصغیر میں باقاعدہ انجمن سازی کا ذکر 1857ء کے بعد ملتا ہے، لیکن اس سے پیشتر ادب و شعر کی محفلیں مغل عہد حکومت میں رؤسا کے ہاں نجی تقریبات کے طور پر یقیناً" منعقد ہوتی رہی تھیں، درباروں سے منسلک شعراء کی محفلیں بھی سجتی رہتی تھیں درباری شاعری تو ایران، ماورائے ایران اور یورپ تک میں پروان چڑھتی رہی، یورپ میں بھی شاہی، درباری شعراء Poets Laureates ہوتے تھے، ایران میں درباری شعرا ملک الشعراء کہلاتے - افغانستان میں ایسے ہی مشاعروں کا تذکرہ پٹہ خزانہ (پوشیدہ خزانہ یا کنز مخفی) کے مولف محمد ہوتک نے اسی کتاب میں کیا ہے، ان مشاعروں میں محمد ہوتک نے خود شرکت کی وہ قندھار میں شاہ حسین کا مقرب تھا، 1135 ہجری میں شاہ حسین کی تخت نشینی کے بعد قصر نارنج میں بادشاہ کے کتب خانے میں یہ محفلیں برپا ہوتیں - شاہ حسین ایک باذوق بادشاہ تھا، خود بھی شعر کہتا - اس کی ان محفلوں کو پشتو کی تاریخ ادب "پٹہ خزانہ" اور اس کے بعد کی کتب میں دربار کا نام دیا گیا - ایران اور برصغیر کے درباروں میں ملک الشعراء اپنے فن کا جادو جگاتے رہتے، اساتذہ فن کا اپنا ایک حلقہ ہوا کرتا جو اپنے اساتذہ کا جانثار ہوتا اور ادبی چپقلشوں میں شمشیر سخن اور برش شمشیر دونوں کے جوہر دکھانے سے دریغ نہ کرتا، اردو کے بڑے بڑے شعراء کی چشمکیں اور معرکے تاریخ ادب اردو کا حصہ ہیں، برصغیر کا آخری ملک الشعراء مرزا غالب تھا جو شیخ محمد ابراہیم ذوق کے بعد شاہ کا استاد ہوا اور غالباً" شاہ کا مصاحب بننے پر اتراتا

پھرا ' ایران کا آخری ملک الشعراء بہار تھا۔

مشاعرہ ہماری ادبی انجمنوں کی مقصدیت کے لئے ایک نشان راہ کا درجہ رکھتا تھا ' جب باقاعدہ ادبی انجمنوں کی تشکیل کا کام شروع نہ ہوا تھا تو مشاعرہ معاشرے میں شعرو سخن کا ذوق پیدا کرنے ' ذوق کی تربیت اور تسکین اور زبان و بیان کی اصلاح کا سبب بنتا تھا ' مشاعروں میں اگر کوئی زبان و بیان یا فن کی غلطی کرجاتا تو محفل میں موجود اساتذہ باآواز بلند اسے ٹوک دیا کرتے یا کوئی بے پناہ چوٹ کرجاتے اور یوں اصلاح کا فریضہ ادا کرتے ایسے تاریخی مشاعروں میں لکھنؤ کا وہ مشاعرہ اہل ذوق کو یاد ہوگا جس میں میر نے دلی کی بربادی کے ضمن میں کہا

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکارے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

داستان گوئی نے بھی ایسی صحبتیں جمائیں جنہوں نے باقاعدہ انجمنوں کا کردار ادا کیا۔ لکھنؤ میں باقاعدہ انجمن سازی اور انجمن بازی سے پہلے خوشحال لوگوں کے ہاں اٹھنے بیٹھنے کا سامان ہوتا۔

مولانا عبدالحلیم شرر ایسی صحبتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"یہاں کا پرانا طریقہ صحبت یہ ہے کہ ہر محلے میں آبادی کے ہر حلقے میں کوئی خوشحال یا دولت مند شخص اپنے گھر میں لوگوں کے آنے اور اٹھنے بیٹھنے کا سامان کرتا ہے ' احباب کی تواضع و خاطرداشت کے لئے حقے پانی وغیرہ ضروری چیزوں کو اپنے ذاتی صرف سے مہیا کرتا ہے اور اس کے ہم مذاق

بلاناغہ اور پابندی سے آتے ہیں دیر تک صحبت رہتی ہے۔ وہاں بذلہ سنجیاں اور لطیفہ گوئیاں ہوتی ہیں۔ ندیمان صحبت کے مذاق کے اعتبار سے ان کی محفلوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے ' ارکان محفل اگر ادب و شعرو سخن کا مذاق رکھتے ہیں تو شاعری ' نثاری اور سخن آفرینی ' سخن سنجی کا چرچا رہتا ہے"

یہ بات صرف لکھنؤ تک ہی محدود نہ تھی ' سارے برصغیر میں صحبتوں کا یہی عالم تھا مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات کو ایسی بعض محفلوں کے حالات سے مالا مال کیا ہمیں یہیں میر تقی میر کی لکھنؤ میں اس ادبی صحبت کا حال معلوم ہوتا ہے ' جہاں میر نے اپنے محولہ بالا مشہور اشعار سنائے جن میں دلی کی تباہی کا تذکرہ ہے۔

پھر مرزا فرحت اللہ بیگ نے دلی کے آخری یادگار مشاعرے کا حال لکھ کر ادب و تاریخ میں ایک اہم اور قابل داد فریضہ ادا کیا ہے۔

باقاعدہ طور پر جن ادبی اداروں نے اردو زبان و ادب میں مثبت اور اثر انگیز کام کیا اور معاشرے میں ادبی ذوق عام کیا ان میں فورٹ ولیم کالج ' دہلی کالج اور سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے نام زندہ ہیں سرسید کی ادبی اور تعلیمی تحریک کو پھیلانے اور آگے بڑھانے میں سائنٹفک سوسائٹی اور رسالہ تہذیب الاخلاق نے بڑا اہم کردار ادا کیا لیکن جدید ادبی تحریکوں میں "انجمن پنجاب" ایک بہت بڑا نام ہے ' 21 جنوری 1865ء اور لاہور ------ یہ زمان و مکان کا وصال ادب جدید کی تاریخ کا حرف آغاز ہے اور اس کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے اگرچہ اس انجمن کا قیام انگریزوں کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا ایک نقاد کے بقول مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ انہوں نے انگریزی ادب و شعر سے متاثر ہو کر "نیچرل شاعری" کے لئے زمین ہموار نہیں کی تھی بلکہ انگریز حاکموں کی واضح ہدایات کے تحت انہیں روایت کے جاندار سرچشموں سے اردو

شاعری کو علیحدہ کرنے کی کوشش کرنا پڑی تھی۔

نظریاتی بحث سے قطع نظر یہ بات صحیح ہے کہ انجمن پنجاب کی داغ بیل انگریزوں کی ہدایت پر پڑی اور اس نے اردو لکھنے والوں کو جس طرح متاثر کیا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں آج کی جدید اردو شاعری عالمی شعری ادب میں جو مقام پیدا کرچکی ہے وہ اسی انجمن کی دین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض انجمنیں مہتم بالشان اداروں کی شکل اختیار کرجاتی ہیں اور ان تنظیموں کی مبسوط کوششیں معاشرے پر :ثر انداز ہوتی ہیں بعض اوقات ان کا لائحہ عمل تحریک کی صورت اختیار کرجاتا ہے۔

قیام پاکستان سے پیشتر اور بعد کئی ادبی انجمنوں اور تنظیموں نے ملک گیر اثرات مرتب کئے، انجمن حمایت اسلام اور انجمن ترقی اردو نے زبان و ادب کی اشاعت اور تحقیق کے میدان میں جو کام کیا وہ تاریخ کے صفحات سے کبھی نہیں مٹ سکتا اسی دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق ایسی تنظیمیں بنیں جو مدمقابل کے طور پر کام کرتی رہیں آج برصغیر میں اردو زبان و ادب کے جو بڑے بڑے نام شہرت کے آسمان پر درخشاں ہیں وہ ان ہی تنظیموں کی وجہ سے ہیں پاکستان رائٹرز گلڈ نے بھی ادیبوں اور ان کی تخلیقات کی اشاعت و تشہیر کے سلسلے میں بہت مثبت کام کیا ان سب انجمنوں اور تنظیموں کے پیچھے صرف چند نام ہیں جو دراصل خود اپنے اپنے طور پر انجمن تھے ان میں علامہ شبلی، سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، سجاد ظہیر، میراجی، احمد ندیم قاسمی، قیوم نظر، ضیا جالندھری، مختار صدیقی، جمیل الدین عالی کے نام ان تنظیموں کی کامیابی کی علامتیں ہیں صوبہ سرحد میں ادب و شعر کا ذوق فارسی سے آیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک سرحد میں کسی مشاعرے کا تذکرہ کسی تحریر میں نہیں ملا۔ البتہ 1897ء کے ایک مشاعرے کا تذکرہ سید جگر کاظمی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے۔

"یہ 1897ء کا دور ہے، استاد غلام حسین مس گر کی (تانبے کے برتنوں) کی دکان شعراء کا اڈہ تھی، یہ شعراء حضرات کبھی کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے تھے یہ عموماً" فارسی گو بلند پایہ شاعر اور ادیب تھے، قاضی طلا محمد طلا، منشی امیرالدین امیر، میاں زین العابدین، غلام محمد خان خٹک، سید شاہ مسکین۔ یہ ایک دوسرے کے ہاں جاتے، شعر سنتے، سناتے۔ فارسی کا کبھی مشاعرہ نہ ہوا تھا۔"

صوبہ سرحد میں پہلے مشاعرے کا ذکر بھی سید جگر کاظمی ہی نے کیا ہے، یہ تذکرہ وہ مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔

"1897ء کا سورج افق سرحد پر چمکا، اردو زبان رات کے تھکے ماندے ستاروں کی طرح یہاں نورانی منظر دکھا رہی تھی سچ ہے کہاں دلی اور کہاں پشاور، مگر اس لشکری زبان میں بلا کا جذب ہے ایک لحاظ سے تو اردو زبان کے جنم دن سے ہی یہاں شعراء اور ادباء پائے جاتے ہیں مگر ہم جس دن سے آئے یہاں اردو زبان میں مشاعرے ہوئے اور ادب اردو کی بنیاد پڑی"

یہاں جگر صاحب پشاور کے پہلے مشاعرے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"پشاور شہر میں پہلا مشاعرہ 1897ء میں اسلامیہ کلب بیرون کابلی دروازہ ہوا ہم اس دور کو دور اول کہیں گے یہاں کے مقامی شعراء یہ تھے، جناب استاد الاساتذہ حضرت احمد علی سائیں، جناب استاد حضرت لعل شاہ برق، مرزا محمد سلطان سلطان، جناب غلام جیلانی صحیح سالم، آقا سجدی شاہ خادم، مرزا غلام عباس، داروغہ محمد یوسف یوسف، حافظ خان محمد

عاصی اور سید لعل شاہ جگر کاظمی ------ یہ مشاعرہ 1897ء
میں اسلامیہ کلب میں زیر صدارت آغا لعل شاہ برق ہوا،
طرح مصرعہ تھا"

پرتو خال سیہ سے ہوئی جگنو مکھی

مرزا سلطان کی غزل کا ایک شعر یاد آگیا

آج میخانہ سے کیوں او کتا نکلا واعظ
بادہ غیظ میں کیا پی گیا الو مکھی

اس مشاعرے کا اہتمام بابو سندر سنگھ سبروال نے کیا تھا۔
گویا پشاور میں یہ پہلا مشاعرہ تھا جو کسی انجمن کے زیر اہتمام نہیں بلکہ
انفرادی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا اس کے بعد دو اور مشاعروں کا تذکرہ ملتا ہے جو کم و
بیش اس مشاعرہ کے چند ہی دنوں بعد منعقد ہوئے ایک مشاعرے کا طرح مصرعہ یہ
تھا۔

لب سے ترے زیادہ یاقوت، لال کیا ہے

اس کے بعد ایک اور مشاعرہ ہوا، جس کی طرح یہ تھی

فیصلہ محشر میں ہوگا داد اور بیداد کا

جگر صاحب کا کہنا ہے کہ ان دنوں پشاور میں ناٹک آئی ہوئی تھی اس میں
منشی غلام علی دیوانہ امرتسری بھی تھے، وہ بھی ان مشاعروں میں شریک ہوئے خوب
رونق بڑھی۔
پشاور میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر ایک اور معرکے کا مشاعرہ
قصہ خوانی کی پشت پر میاں ظہیر الدین وکیل کے بالا خانے پر منعقد ہوا۔
اس مشاعرے کے بارے میں جگر صاحب لکھتے ہیں کہ
مس گر کی دکان پر آنے والے شعراء سے مشورے کے بعد
ایک اچھا مشاعرہ برپا کرنے کا خیال آیا، چنانچہ مسگر کی دکان پر

آنے والے شعراء مشاعرے میں اپنا کلام پڑھنے پر رضا مند
ہوگئے اور اس کے بعد سے پشاور میں ہزاروں مشاعرے
ہوئے ہیں خوش قسمتی سے مجھے اس مشاعرے میں شرکت کا
موقعہ ملا یہ مشاعرہ قصہ خوانی بازار کی پشت پر ایک بالا خانے
میں ہوا تھا، شعراء اور سامعین کی تعداد تیس کے قریب تھی
مشاعرے کے صدر سر صاحبزادہ عبدالقیوم تھے۔ مصرعہ طرح یہ
تھا

جان لینے لگی فرقت جانکاہ کسی کی

جن شعرائے کرام نے اس مشاعرے میں حصہ لیا ان کے
اسمائے گرامی جو مجھے یاد ہیں یہ ہیں، مسجدی شاہ خادم، مسگر،
حافظ محمد خان عاصی، مرزا امانت، برق، خالص، فیروز، ماہر،
جعفری سرحدی میر عباس، مرزا دلاور بیدل، مرزا سلطان محمد
سلطان، عبدالحمید مدبر، سائیں اور فارسی شعراء سید جی میاں
شاہ مسکین، زیب العابدین عابد، قاضی طلا محمد خان طلا، منشی
امیر الدین امیر، مرزا غلام عباس عباس اور غلام محمد خان خٹک
۔ اس مشاعرے میں پڑھی جانے والی غزلوں کے چند اشعار جو
مجھے یاد ہیں پیش کرتا ہوں، آغا مسجدی شاہ خادم کا یہ شعر پسند
مشاعرہ ہوا۔

فرہاد کی مانند محبت میں الہی
برباد نہ ہو محنت جانکاہ کسی کی

ان کے بعد مسگر صاحب نے غزل پڑھی ان کے اس شعر پر
کافی داد ملی کہ سادہ اور بامحاورہ ہے۔

اللہ رے اظہار تمنا یہ شب وصل

تحریروں کے پیش نظر درست معلوم نہیں ہوتی وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"1890ء سے مسگر مرحوم کی دکان پر تیسرے دور
کے شعرا کی بیٹھک شروع ہو چکی تھی اس گروہ کی باقاعدہ
نشست گاہ کے قیام کے بعد اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔
جگر کاظمی کلکتہ سے لوٹے تو اسی حلقے میں پہنچے، خاص کمی بمبئی
سے آئے تو انہیں بھی علم و ادب کی تشنگی نے اس چشمے پر
پہنچایا قاضی قضا بھوپال سے تشریف لائے، لعل شاہ برق نوشہرہ
سے پشاور منتقل ہوئے تو یہ حضرت بھی اسی مرکز سے وابستہ
ہوئے ادھر دلاور خان بیدل (پشاوری) اور آغا فتح خان نشتر کو
اس اڈے کا سراغ ملا اور وہ بھی کشاں کشاں یہیں آپہنچے اس
اجتماع نے غور و فکر کی راہیں پیدا کیں اور 1897ء میں
دوسرا مشاعرہ سائیں مرحوم کے زیر اہتمام ان کے ایک
دوست اور مداح عبدالواحد خان کے مکان پر منعقد کیا گیا اس
مشاعرہ میں پبلک کچھ زیادہ نہ تھی کیونکہ یہ ابتدائی مشاعرہ تھا
اور پروپیگنڈہ کے ذرائع سے یہ لوگ کچھ زیادہ باخبر نہ تھے
البتہ اس میں وقت کے تمام نامور شعراء نے شرکت کی،
مصرعہ طرح تھا

کیا خوش نصیب آنکھ ہے کیا کامگار آنکھ

اس زمین میں سائیں کا مشہور شعر ہے

جلوے ترے سمیٹ سکوں میں محال ہے
پیدا اگر ہو ہر بن مو سے ہزار آنکھ

جگر صاحب 1889ء میں کشمیر چلے گئے، 1900ء میں کشمیر سے واپس آئے ان ہی دنوں سائیں احمد علی بھی راولپنڈی سے پشاور آگئے مسگر کی دکان پھر سے

شعراء کا مرکز بن گئی اور بقول جگر مرحوم "مسگر کی دکان ہی گویا بزم مشاعرہ تھی" مسجدی شاہ خادم بھی یہاں ملے مرزا صحیح سالم سے بھی یہیں ملاقات ہوئی کبھی کبھی یہاں آغا اسد اللہ شاہ (یعنی پطرس بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کے والد) بھی شعر و سخن سے نوازتے سید فتح علی شاہ نشتر بھی گاہے گاہے تشریف لاتے ایک پر رونق مشاعرہ اس نئے دور یعنی 1901ء میں پھر اسلامیہ کلب میں ہوا اس مشاعرے کی طرح تھی

محبت دم خفا کرتی ہے گھونگھر والے بالوں کی

جگر صاحب اس مشاعرے کے سلسلے میں فرماتے ہیں

اس میں بہت لوگ شامل تھے، اس سے پہلے بڑا اردو مشاعرہ
پشاور کی تاریخ میں نہیں ہوا مدبر، عاصی، خادم، سائیں، صحیح
سالم، منشی غلام علی دیوانہ اور پشاور چھاؤنی کے شعراء بھی
شریک تھے۔

اس مشاعرے کے شریک شعراء کے منتخب اشعار ملاحظہ ہو۔

سید جگر کاظمی

خبر لے اے مسیحائے زماں ہم آشفتہ حالوں کی
محبت دم خفا کرتی ہے گھونگر والے بالوں کی

سائیں احمد علی

ہماری جان محزوں کے لئے فرقت میں ایذا کو
فلک نے سیکھ لیں چالیں ستمگر تیری چالوں کی

فتح علی نشتر

وہ دامن کو اٹھا لیتے ہیں جس رہ سے گزرتے ہیں
نہ ہوتی خاک دامنگیر ان کے پائمالوں کی

دیوانہ امرتسری

چمن کے پھول نظروں میں مری سب ہوگئے کانٹے

محبت ہوگئی ہے جب سے تیرے گورے گالوں کی

اس کے بعد دوسرا مشاعرہ بھی اسی مقام پر ہوا۔ طرح مصرعہ یہ تھا

خیال جب ترا کنج مزار میں آیا

اس طرح چند شعر یہ ہیں

سائیں احمد علی

جنوں کا جوش بڑھا پھر کفن ہوا پرزے
خیال جب ترا کنج مزار میں آیا

جگر کاظمی

الم کشیدہ فرقت وہ گل ہوں میں کہ مری
نہ آرزو کا ثمر شاخسار میں آیا

اس زمانے میں پشاور کے شعراء کی غزلیں "مسیحائے امرتسر" میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ مسیحائے امرتسر میں دی گئی طرح پر شعرائے پشاور نے غزلیں لکھیں جو اس پرچے میں شائع ہوئیں۔ طرح تھی

دماغ اپنا نہ کیوں ہو آسماں پر

اس طرح یہ مرزا سلطان کا شعر تھا:

ڈھئی دی ہے تمہارے آستاں پر
دماغ اپنا نہ کیوں ہو آسماں پر

جگر کاظمی

زکواۃ حسن ہو کچھ تو عنایت
کھڑا ہوں مثل سائل آستاں پر

فتح شاہ نشتر

مری بوتل کا زاہد کاگ اڑ کر
ستارہ بن گیا ہے آسماں پر

سید جگر کاظمی مرحوم نے 1904ء میں منعقد ہونے ایک ہندکو مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اپنی تاریخی نوعیت اور دلچسپی کے سبب اہمیت رکھتا ہے۔ کاظمی مرحوم لکھتے ہیں۔

1904ء کا زمانہ ہے پشاور کے شمال میں بالا حصار (قلعہ) کے پل کے پاس ایک ہندو رلا رام کا باغ جہاں آج سرکاری مرغی خانہ ہے (اور اب ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت میں بدل گیا ہے) ایک ہندکو مشاعرہ ہوا، سائیں (احمد علی) صاحب میر مشاعرہ ہوئے اس مشاعرے میں یہ شعراء شامل تھے، مٹھو، گل، عبداللہ، محمد یونس، پنڈی کا ایک شاعر وحشی (ہندو)، دوسرا سالگ رام سالگ، حیدر پنجابی اور شاگرد پیشہ لوگ بھی۔

جگر صاحب نے اس ضمن میں ایک عجیب بات لکھی ہے۔

"مشاعرہ میں اندرونی پھوٹ بھی تھی، سائیں صاحب نے میرے ساتھ مشورہ کیا کہ دشمن کو کس طرح نیچا دکھائیں۔ میں نے مشورتاً" یہ طرح دی، (یار وجدی)۔ اب غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا، سامعین بکثرت تھے۔ ہندو اور مسلم سخن فہم موجود تھے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پشاور کے شعراء میں ہمیشہ سے چپقلش رہی ہے سائیں کے مخالفین میں عبداللہ اور مٹھو تھے اور ان کے درمیان چپقلش کی غماز کئی حرفیاں ملتی ہیں۔

سائیں نے یہ مشہور زنجیری دار حرفی پڑھی۔

کس نے نے ایجاد کیتا

محبت ہو گئی ہے جب سے تیرے گورے گالوں کی

اس کے بعد دوسرا مشاعرہ بھی اسی مقام پر ہوا۔ طرح مصرعہ یہ تھا

خیال جب ترا کنج مزار میں آیا

اس طرح چند شعر یہ ہیں

سائیں احمد علی

جنوں کا جوش بڑھا پھر کفن ہوا پرزے
خیال جب ترا کنج مزار میں آیا

جگر کاظمی

الم کشیدہ فرقت وہ گل ہوں میں کہ مری
نہ آرزو کا ثمر شاخسار میں آیا

اس زمانے میں پشاور کے شعراء کی غزلیں "مسیحائے امرتسر" میں شائع ہونے لگیں۔ چنانچہ مسیحائے امرتسر میں دی گئی طرح پر شعرائے پشاور نے غزلیں لکھیں جو اس پرچے میں شائع ہوئیں۔ طرح تھی

دماغ اپنا نہ کیوں ہو آسماں پر

اس طرح یہ مرزا سلطان کا شعر تھا:

دھنی دی ہے تمہارے آستاں پر
دماغ اپنا نہ کیوں ہو آسماں پر

جگر کاظمی

زکواۃ حسن ہو کچھ تو عنایت
کھڑا ہوں مثل سائل آستاں پر

فتح شاہ نشتر

مری بوتل کا زاہد کاگ اڑ کر
ستارہ بن گیا ہے آسماں پر

سید جگر کاظمی مرحوم نے 1904ء میں منعقد ہونے ایک ہندکو مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اپنی تاریخی نوعیت اور دلچسپی کے سبب اہمیت رکھتا ہے۔ کاظمی مرحوم لکھتے ہیں۔

1904ء کا زمانہ ہے پشاور کے شمال میں بالا حصار (قلعہ) کے پل کے پاس ایک ہندو رلا رام کا باغ جہاں آج سرکاری مرغی خانہ ہے (اور اب ریڈیو پاکستان پشاور کی عمارت میں بدل گیا ہے) ایک ہندکو مشاعرہ ہوا، سائیں (احمد علی) صاحب میر مشاعرہ ہوئے اس مشاعرے میں یہ شعراء شامل تھے، مٹھو، گل، عبداللہ، محمد یونس، پنڈی کا ایک شاعر وحشی (ہندو)، دوسرا سالگ رام سالک، حیدر پنجابی اور شاگرد پیشہ لوگ بھی۔

جگر صاحب نے اس ضمن میں ایک عجیب بات لکھی ہے۔

"مشاعرہ میں اندرونی پھوٹ بھی تھی، سائیں صاحب نے میرے ساتھ مشورہ کیا کہ دشمن کو کس طرح نیچا دکھائیں۔ میں نے مشورتاً" یہ طرح دی، (یار وجدی)۔ اب غیر طرحی مشاعرہ شروع ہوا، سامعین بکثرت تھے۔ ہندو اور مسلم سخن فہم موجود تھے۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ پشاور کے شعراء میں ہمیشہ سے چپقلش رہی ہے سائیں کے مخالفین میں عبداللہ اور مٹھو تھے اور ان کے درمیان چپقلش کی غماز کئی حرفیاں ملتی ہیں۔

سائیں نے یہ مشہور زنجیری دار حرفی پڑھی۔

کس نے نے ایجاد کیتا

چاڑا چرخ تے کس نے خراد کیتا
کس دے درد نے صاحب فریاد کیتا
کس دی بنسری وچ سنسار وجدی

اب تک پشاور میں جتنے مشاعرے بھی ہوئے ان میں وہ سبھی شعراء شامل ہوتے رہے جو مرزا غلام حسن مسگر کی دکان کو بزم ادب بنائے رہے اور ان کا انتظام و انصرام انفرادی طور پر ہوتا رہا یہ سب کچھ کسی انجمن کے تحت نہ ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دن مرزا غلام حسین مسگر کی دکان شعراء کا اڈہ بنی اسی دن بزم سخن کی بنیاد پڑ گئی تھی پھر یوں ہوا کہ جعفری سرحدی نے بھی کوچہ رسالدار میں پنساری کا دکان کھول لی اور یہاں بھی شعراء کا جمگھٹا ہونے لگا اور یوں کوچہ رسالدار شعراء کا اکھاڑہ بن گیا۔

لیکن بزم سخن کے نام سے جب ان سب حضرات کی محبتوں اور دوستیوں اور رقابتوں کو یکجائی حاصل ہوئی تو گویا کوچہ رسالدار کے ان احباب کی محفل نے شناخت پیدا کرنے کے لئے اسے بزم سخن کہنا شروع کیا تھا۔ 1903ء وہ مبارک سال تھا جب اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔ ان حضرات انجمن کے سرخیل سائیں احمد علی تھے جو اس وقت استاد کا درجہ رکھتے تھے یوں سائیں اولیں انجمن ساز اور بزم سخن اولیں انجمن ہے جس نے سرحد میں باقاعدہ طور پر ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا غلام حسین مسگر کی دکان پشاور کے ایک اہم کوچے یعنی کوچہ رسالدار میں تھی یہ ایک مرکزی مقام تھا اور پشاور کے تاریخی بازار قصہ خوانی کی جنوبی پشت پر واقع تھا جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ غلام حسین پیشے کے لحاظ سے تانبے کے برتن بناتے تھے اور اس حوالے سے مسگر تخلص کیا یہی دکان بزم سخن کا صدر دفتر بنی۔ اس انجمن کے قیام کے بعد اس کا پہلا مشاعرہ بارود خانہ بیرون کوہاٹی دروازہ میں منعقد ہوا۔

بزم سخن کے ابتدائی اراکین میں غلام حسین مسگر، سائیں احمد علی، سید

جگر کاظمی، غلام جیلانی صحیح سالم، سید لال شاہ برق، آغا سجدی شاہ خادم اور مرزا غلام عباس شامل تھے، بعد میں مستری خالص کی، فتح شاہ نشتر (وکیل) قاضی محمد عمر قضا، تیسرے دور میں سید ضیاء جعفری، میر عباس، قمر علی قمر سرحدی، فدا علی فدا، محمد علی شاہ، سید شیرازی، ملک ناصر علی خان، محمود الحسن کوکب تبریزی سردار عبدالرب نشتر، امانت علی امانت، رضا ہمدانی شامل ہو گئے۔

بزم سخن کے بارے میں سید جگر کاظمی نے ایک طویل غزل بھی لکھی جس سے بزم سے وابستہ شعراء کا پتہ چلتا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چلی کچھ ایسی ہوائے بہار بزم سخن
چمک رہے ہیں ہر اک سو ہزار بزم سخن
نہ پہنچے عرش پہ کیونکر دیار بزم سخن
جناب میر جو ہیں تاجدار بزم سخن
جناب خادم و بیدل بھی اور خالص بھی
جناب سائیں کہ ہیں افتخار بزم سخن
جناب داغ و امیر و جلال کے پیرو
ہزار جان سے ہیں جنبہ دار بزم سخن
وہ بندشیں وہ تراکیب اور وہ مضموں
وہ با محاورہ اردو ہے یار بزم سخن
جناب نشتر و سعدی، قضا و فاروقی
ہے جن کے دم سے رواں آبشار بزم سخن
فدا و بسمل و جعفر، ضیا و ناصر و نذر
مہکتا جن سے ہے یہ لالہ زار بزم سخن
جناب سبز علی خان کہ جن کی برکت جود
سدا رہی ہے مددگار و یار بزم سخن

قمر وہ برق وہ مشتاق و شوق اور فیروز
وہ برگ و حضرت رعنا وقار بزم سخن
جناب مسکر و عاصی و شاطر زیجاہ
الٰہی بخش انہیں تھے وہ یار بزم سخن
جناب میر و امانت و خوش گلو شاعر
بجا ہے ان کو کہو موسیقار بزم سخن

جگر مرحوم کی اس غزل میں بزم سخن سے منسلک جن شعراء کے نام آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے - یہ غزل انہوں نے بزم سخن کی یادیں تازہ کرنے کے لئے بہت بعد میں کہی جب کہ اکثر شاعر احباب فوت ہو چکے تھے -

(1) میر عباس میر (2) مسجدی شاہ خادم (3) دلاور خان بیدل پشاوری شاگرد غریب سہارنپوری (4) مستری خان محمد خالص مکی (5) سائیں احمد علی (6) داغ کے شاگرد قاضی قضاء (7) امیر کے شاگرد اور بھانجے مولانا امیر احمد میر مینائی اسلامیہ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے (8) جلال لکھنوی کے شاگرد سید لعل شاہ برق گنجوی تھے (9) سردار عبدالرب نشتر (10) سعدی افغانی آپ ایڈورڈز کالج میں پروفیسر رہے (11) داغ کے شاگرد قاضی محمد عمر قضا روحی (12) محمد محسن فاروقی یہ اسلامیہ کالج میں عربی اور فارسی پڑھاتے تھے اور پروفیسر محمد طاہر فاروقی کے والد تھے (13) فدا محمد فدا ایم لال چند (14) بسمل پشاوری (15) جعفر علی جعفری جو بعد میں نابینا ہو گئے (16) سید عنایت علی شاہ ضیاء جعفری (17) ملک ناصر علی ناصر (18) نذیر میرزا برلاس (19) سبز علی خان جو شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور انجمن کی مالی مدد کرتے (20) عبدالودود قمر سرحدی (21) سید محمد شاہ برق کوہاٹی (22) بابو فضل الٰہی مشتاق (23) چیلا رام شوق (24) بابو فیروز دین فیروز (25) مرزا عبدالرشید خان برگ پشاوری (26) سید سکندر شاہ رعنا کاظمی (27) غلام حسین مسکر (28) خان محمد عاصی (29) چیلا رام شوق کے استاد بیلی رام شاطر امرتسری (30) میر عباس

میر (31) ملک امانت علی امانت

بزم سخن میں شعر کے پروانے اس کی روشنی پیتے رہے - یہ انجمن ایک کلاسیکی انداز کی حامل تھی اور اس کے اراکین بھی کلاسیکی شعری ادب کے دیوانے تھے اس لئے ان کی اس ادارے پر اجارہ داری سترہ برس تک قائم رہی - 1920ء میں ایک شعلہ مستعجل ایسا اٹھا کہ اس کی جوانی اور عملی قوت نے بزم سخن پر ایک کاری ضرب لگائی یہ فعال جوان قمر علی قمر سرحدی تھا جس نے کوچہ رسالدار میں ایک ہوٹل کھول کر شعراء کو اپنی طرف کھینچا - بزم سخن سے بعض اختلافات کے پیش نظر قمر سرحدی نے خالص مکی اور چند دوسرے ساتھیوں کی معیت میں لطف سخن کے نام سے ایک نئی انجمن کی بنیاد ڈالی اس انجمن کا کوئی خاص نقطہ نظر نہ تھا محض بزم سخن کی مخالفت کے تحت اسے نیچا دکھانے کی کوششیں شروع ہو گئیں لطف سخن کے حملوں نے بزم سخن کو پھر سے فعال بنا دیا اور دونوں انجمنوں کے درمیان تقابلی جنگ پانچ چھ برس تک جاری رہی چنانچہ بزم سخن کا دوسرا دور بعض جوان شعرا یعنی جعفر علی جعفری ، سردار عبدالرب نشتر ، سید ضیاء جعفری ، میر عباس میر اور امانت علی امانت کے ہاتھوں چمکا ، بزم سخن کے فعال ہونے پر لطف سخن نے باہر سے آئے ہوئے شعراء کو اپنے ساتھ ملایا ایسے لوگوں میں عیش فیروز پوری ، اسلامیہ کالج کے فارسی زبان کے پروفیسر مولانا امیر میر مینائی جو بہت پر گو شاعر شامل تھے ان پر گو شعراء کی بدولت دونوں اداروں میں خوب چلتی رہتی اور آخر دونوں اداروں میں ڈنڈے چل گئے اور دونوں طرف سے شعراء گرفتار ہوئے اور تھانے پہنچ گئے - آخر کار ان میں صلح صفائی ہو گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا -

آغا سید محمد شاہ برق کوہاٹی بزم لطف سخن میں شامل ہو گئے وہ میر عباس کے عزیز ترین دوستوں میں تھے ان کا قہوہ خانہ مسلم ہوٹل کے قریب تھا ، کچھ کاروباری رقابت ، کچھ شاعرانہ چپقلش اور کچھ اس انجمن کی معرکہ آرائی کے سبب وہ لطف سخن سے الگ ہو کر بزم سخن میں شامل ہو گئے ، محمد شاہ برق بھی ان کے ساتھ بزم

سخن میں شامل ہو گئے اور آخر تک اس کے رکن رہے ۔

اس ہنگامے کے بعد دونوں انجمنیں خاموش ہو گئیں لیکن 1925ء میں الیگزانڈر تھیٹریکل کمپنی کے پشاور آنے پر قمر سرحدی کو اس تھیٹر کے جانے پہچانے اہل قلم مل گئے اور لطف سخن نے پھر ہنگامہ پرور تقریبات کا آغاز کر دیا چنانچہ دونوں انجمنوں میں پھر سے معرکہ آرائی شروع ہو گئی - ان ہی دنوں شاہد کیانی بھی لطف سخن کے رکن بن گئے لیکن انہوں نے آکر یہ کرشمہ دکھایا کہ لطف سخن کا نام بدل کر بزم ادب کر دیا ، لیکن بزم سخن کی رقابت کو برقرار رکھا ۔

لطف سخن بعض محققین کے خیال میں پشاور کا پہلا ادبی ادارہ تھا جس نے 1920ء میں بزم سخن کی اجارہ داری پر ضرب لگائی - لیکن بزم ادب کے نام سے لطف سخن کی کایا کلپ اور میر عباس اور آغاز محمد شاہ برق کے بزم سخن میں جانے سے اس کو نئی زندگی مل گئی اب اس انجمن میں بھی بعض نوجوان شعراء کی شرکت سے حرکت اور تیزی آگئی ، 1936ء میں پشاور چھاؤنی میں ایک نئی انجمن بزم افکار کے نام سے وجود میں آئی اس میں پشاور سے باہر سے آئے ہوئے خصوصی طور پر اہل زبان شعراء شامل تھے ان میں رسا بریلوی ، عزیز صہبائی ، عباس اثر اور مقامی شعراء میں سے ناطق درانی اور سید ذوالفقار علی بخاری جیسے شعراء تھے ، ان شعراء میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو چھاؤنی کے انگریزوں کے گھریلو ملازم تھے یا ٹھیکیداری کے ضمن میں پشاور آئے تھے ، بزم افکار نے چند معرکے کے مشاعرے منعقد کرائے اور اپنے باہر کے دوستوں کو مدعو کیا حفیظ جالندھری بھی آئے جو اپنے خوبصورت اور دلکش ترنم کی وجہ سے ملک بھر میں بڑی شہرت کے حامل تھے ان کی وجہ سے بزم افکار چمک اٹھی ، بزم سخن والوں کو بزم افکار کی شہرت ایک آنکھ نہ بھائی انہوں نے حفیظ جالندھری کے مقابلے میں میر عباس اور امانت کو ترنم سے کلام سنانے کے لئے تیار کیا ، دونوں نے حفیظ صاحب کے خلاف شعر بھی پڑھے - یوں پشاور میں اس چپقلش سے ایک گرما گرمی پیدا ہو گئی ، اس سلسلے کے دو ایک شعر جنے

جو عباس اور امانت نے پڑھے ۔

زبان پوچ ، شباہت قبیح ، فکر غلیظ
یہی ہے شاعر پنجاب ، کیا یہی ہے حفیظ

یا

شعر پڑھنے کے لئے اب زیر و بم درکار ہے
شاعر و قوال کی پہچان اب دشوار ہے

اب بزم افکار کے مقابلے میں بزم سخن اور بزم ادب دونوں نے مل کر انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی اس کے کرتا دھرتا بھی قمر سرحدی تھے ، انہوں نے مولوی عبدالحق کی صوابدید سے انجمن ترقی اردو (دکن) اورنگ آباد سے الحاق کر لیا ۔

1933ء میں سرحد کے باشعور اور جدید تعلیم سے آراستہ نوجوانوں اللہ بخش یوسفی اور نذیر میرزا برلاس نے محمد علی کلب کی بنیاد ڈالی اور چند بہت اچھے مشاعرے کرائے لیکن یہ کلب زیادہ دیر نہ چل سکا - اللہ بخش یوسفی تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے اور انہیں مولانا محمد علی جوہر سے قریبی ربط تھا یہ کلب انہیں کے نام سے قائم ہوا تھا اس ادارے نے نوجوان اہل قلم کی سرپرستی کی اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا اس سے ان نوجوان اہل قلم کے دلوں میں علم و ادب کی محبت کے جذبے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اللہ بخش یوسفی سرحد کی جدید صحافت میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں ان کی سیاسی ، قومی ، دینی بصیرت ، صحافتی علمیت اور تاریخ دانی نے سرحد کے ادب و صحافت میں تحقیق کا مادہ پیدا کیا اور صحافت کو بہت فائدہ پہنچایا اور مالا مال کیا ۔

پشاور کی ادبی انجمنوں کی آپس کی چپقلشوں سے ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اراکین فعال ہو گئے اور شعر و ادب کا ذوق پھیلا اور کئی ایسے نئے شعراء ادباء ابھرے جو بعد میں ملک گیر شہرت کے مالک بنے ۔

1935ء میں دائرہ ادبیہ کی تشکیل ہوئی ' یہ ایسے نوجوانوں کا ادارہ تھا جو
بزم سخن کے قدیم فکر و نظر اور خیالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے اور نئے
اور ترقی پسندانہ رجحانات لے کر آئے اس ادارے کے بانیوں میں سید ضیاء جعفری
' نذیر میرزا برلاس ' عبدالودود قمر ' اسیر انور ضیائی ' حبیب اشیائی ' فارغ بخاری '
رضا ہمدانی ' سید مظہر گیلانی ' لالہ مضمر تاتاری تھے ' یہ سب لوگ سید مظہر گیلانی کے
مکان پر جو ریتی دروازے میں واقع تھا ' جمع ہوئے ' پھر دائرے کے دفتر کے لئے
عبدالودود قمر نے شاہ ولی قتال کی خانقاہ کے دروازے سے ملحقہ ایک چھوٹے سے
کمرے کے حصول میں کامیابی حاصل کی یہ کوچہ قصہ خوانی کے عین وسط میں تھا '
دفتر بانسوں کی دکانوں میں گھرا ہوا تھا ڈاکٹر عبدالودود قمر کی انتظامی صلاحیتیں اس
ادارے کو چلانے میں کامیاب ہوئیں اور یہ دفتر 1930ء سے 1948ء تک قائم
رہا اس دفتر کو قمر صاحب روزانہ شام کو کھولتے اندر اور باہر ایک اینٹ اونچے
چبوترے پر جھاڑو لگاتے گرمیوں میں اندر باہر چھڑکاؤ کرتے ۔ کچھ بانسوں کی بھینی
بھینی خوشبو کچھ مٹی کی سوندھی سوندھی مہک اس ماحول کو شاعرانہ بنا دیتی وہ
چارپائیاں اور دو چار کرسیاں لگا دیتے ' لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ایک
ایک کر کے آنا شروع کر دیتے اور نصف شب تک یہ محفل شعر و سخن جمی رہتی ' جو
شاعر یا ادیب اپنا تازہ شہ پارہ لکھتا وہ یہاں آکر احباب دائرہ کو سناتا ' دائرہ ادبیہ کا
حلقہ ارباب ذوق کی طرح سہ ماہی یا ماہنامہ شیڈول نہ ہوتا بلکہ حلقہ ارباب ذوق ہی
کی طرح (بعض اوقات) حاضر بال تنقید کے لئے پیش ہو جاتا ۔ یہ تنقید ترقی پسند
مصنفین کی طرح بیدردانہ نہ ہوتی بلکہ جو کوئی اپنا تازہ شہ پارہ نظم و نثر میں پڑھتا
وہ نو آموزوں میں ہوتا تو اس کی ہمت افزائی کی جاتی ' اگر پختہ کار ہوتا تو باقی
اساتذہ فنی اصولوں کو سامنے رکھ کر شہ پارے کی خوبیاں اور خامیاں پرکھتے اور داد
کے علاوہ مشورے پیش کرتے ' یہاں جو شاعر ادیب اپنا شہ پارہ جب لکھتا اور جب
سنانا چاہتا سنا سکتا تھا ' حاضرین کی رائے کبھی نیچا دکھانے کے جذبے کی نمائندگی نہ

کرتی بلکہ مخلصانہ ہوتی ' پڑھنے والوں کو ان مشوروں سے بہت کچھ حاصل ہوتا '
دائرہ ادبیہ کی حیثیت ایک دانشگاہ کی سی تھی اس دانشگاہ میں مجید شاہد ' خاطر غزنوی
' احمد فراز ' یعقوب نظر ' عشرت ملک ' محسن احسان نے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ادبی
حیثیت باہر کی دنیا سے منوائی ۔

دائرہ ادبیہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ' پشاور میں ہر شخص جانتا تھا
کہ دائرہ ادبیہ اہل قلم کا ایک ٹھیہ ہے جو شاہ ولی قتال میں واقع ہے اور سارا
سال بغیر ناغہ کئے شعراء ادباء اور اہل ذوق کے لئے اپنے وا آغوش کے ساتھ ہر
ایک کو خوش آمدید کہتا ہے ' برصغیر کے کونے کونے سے یہاں بڑے بڑے صاحبان
علم و دانش یہاں آئے مقامی اہل قلم باہر کے باکمال اہل دانش مہمانوں کی باتیں
اور ان کے شہ پارے سنتے اور بہت کچھ حاصل کرتے یہاں مولانا حسرت موہانی '
مرزا فہیم بیگ چغتائی ' ڈاکٹر اعظم کریوی ' علامہ سیماب اکبر آبادی ' روش صدیقی '
ن م راشد ' حمید نسیم ' نبیرہ آزاد ' الطاف گوہر ' شاہد احمد دہلوی ' سید عابد علی عابد '
احمد ندیم قاسمی ' ایس ایس نیازی ' مولانا عبدالمجید سالک ' حفیظ جالندھری ' سید
ذوالفقار علی بخاری ' قتیل شفائی ' سیف الدین سیف ' عبدالحمید عدم ' ظ انصاری '
نیاز حیدر اور نجانے کون کون سی شخصیات آئیں ۔

قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں لاہور میں جو ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا
شعراء اور ادباء ہوٹلوں میں ہی بیٹھتے اور ادبی بحثیں ' تنقیدی محفلیں اور سخن
آرائی کرتے عرب ہوٹل ' نگینہ بیکری ' پاک ٹی ہاؤس ' کافی ہاؤس وغیرہ ادیبوں کی
مستقل نشست گاہیں رہیں ۔ کراچی میں بھی ادباء کا ٹھکانہ زیادہ تر ہوٹل اور کافی
ہاؤس رہے ہمارے پشاور میں لاہور اور کراچی کے برعکس شخصی و نجی بیٹھکوں میں
ادبی محفلیں جمتیں ' یہ روایت سگر کی دکان سے چلی ' قمر سرحدی کا مسلم ہوٹل ' میر
عباس میر کا قہوہ خانہ یکہ توت میں شاہد کیانی کی رہائش گاہ ' شاہ ولی قتال میں دائرہ
ادبیہ ' کوچہ رسالدار میں جعفر علی جعفری کی دکان ' عبدالواحد کا مکان ' میوہ منڈی

میں جامع مسجد سے ملحق سیٹھی صاحب کا بالا خانہ، شاہی باغ، وزیر باغ اور رلے ک
باغ ادیبوں کی نشستوں کے لئے مخصوص ہوگئے، پھر شاہ ولی قتال میں عبدالودود قم
کی حاصل کردہ وہ بیٹھک جو دائرہ ادبیہ کی پہچان بن گئی تھی سنگ میل کے جاری
ہونے اور فارغ رضا اور خاطر کی مصروفیت کے پیش نظر نقل مکانی کرکے محلہ خدا
داد میں سنگ میل کے دفتر میں پہنچ گئی پھر مظہر گیلانی، صیغم لاج، شوکت واسطی ک
صدر کی کالی باڑی میں اردو سبھا اور پھر اردو مرکز کا دفتر، گھنٹہ گھر کے ساتھ خادم
تمباکو والے کی دکان، پشاور یونیورسٹی میں ڈاکٹر مظہر علی خان کے یونیورسٹی میں سب
سے بڑے بنگلے کا سب سے چھوٹا ڈرائنگ روم، قصہ خوانی بازار میں میاں
سعیدالرحمان کی میاں شریف حسین کے بورڈ والی دکان، خاطر غزنوی کا یونیورسٹی ک
S-28 والا بنگلہ اور پریشان خٹک کا مولانا عبدالقادر سے ورثہ میں حاصل کیا ہوا
R-5، یہ سب جگہیں شعراء، ادباء، اہل قلم، پروفیسروں اور صحافیوں کا مستقل
ٹھکانہ بن گئیں میر عباس اور قمر علی قمر سرحدی کے ہوٹلوں میں بھی کراچی لاہور ک
طرح شعراء کرسیوں پر چپک کر نہیں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

دائرہ ادبیہ کی تشکیل کا سال 1935ء اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس
سال 5 مارچ کو اعشاریہ پانچ طاقت کا ایک ریڈیو ٹرانسیٹر صوبائی حکومت کو مارکو
کی طرف سے تحفے کے طور پر ملا اور سب سے پہلے کرنل نول نے جو محکمہ زراعت
کے سیکرٹری تھے اس کے پروگرام مرتب کئے یہ ٹرانسیٹر دراصل زرعی معلومات
منصوبوں کی تشہیر کے لئے ملا تھا اس ریڈیو سے پشتو اور اردو زبانوں میں پروگرا
نشر ہونے لگے مختلف دیہات کے حجروں اور پشاور کے چوک یادگار میں ریڈیو نص
کردیئے گئے اور لوگ ان سے مستفید ہونے لگے پھر لوگوں نے اپنے ذاتی استعما
کے لئے ریڈیو خریدنے شروع کردیئے۔

محققین کے خیال میں برصغیر کا سب سے پہلا مشاعرہ نشر کرنے کا اعز
پشاور ریڈیو ہی کو نصیب ہوا اس زمانے میں شعراء کو مشاعروں میں شرکت

معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ یہ عزت افزائی انجمنوں کے حصے میں آتی اپنے شعراء
کو لے کر انجمنوں کے سربراہ ریڈیو پہنچ جاتے اور مشاعرہ ہوجاتا۔ سب سے پہلے یہ
فخر دائرہ ادبیہ کو حاصل ہوا اس کے شعراء نے ریڈیو پر پہلا مشاعرہ پڑھا اس
مشاعرے میں دائرہ ادبیہ کے شعراء کو بزم سخن کے خلاف بات کرنے کا سنہری موقعہ
ہاتھ آیا چنانچہ سید ضیاء جعفری نے بزم سخن کے معزز رکن آغا سید برق کوہاٹی کے
خلاف یہ دوبیتی پڑھی۔

رستگاری کی اس میں بات کہاں
یورش ابر سے نجات کہاں
مہرومہ سے اسے نہ دو نسبت
شعلہ برق کو ثبات کہاں

یہ مشاعرہ سن کر بزم سخن والوں نے ریڈیو والوں سے احتجاج کیا، ریڈیو
والوں کو ان چپقلشوں کا کیا علم تھا سٹپٹا گئے اور آئندہ کے لئے محتاط ہوگئے دوسرا
مشاعرہ بزم سخن والوں نے کرنا تھا۔ ریڈیو والوں نے ان سے کلام پہلے بھیجنے کی شرط
لگائی انہیں بے ضرر کلام مل گیا۔ لیکن ہر شاعر نے نشریے کے دوران اپنے کلام
سے پہلے ایک آدھ رباعی قطعہ ضرور پڑھا پروگرام کی ریکارڈنگ کا اس زمانے میں
تصور بھی نہ تھا ان قطعات اور رباعیات میں وہ بھی اپنے مطلب کی بات خوبصورتی
سے کہہ گئے، ضیاء صاحب کی دوبیتی کے جواب میں برق صاحب کا یہ شعر گونجا

نہ پوچھ رتبہ اوج کمال اہل کمال
فلک پہ برق درخشاں ضیاء زمیں پر ہے

جب ریڈیو والوں نے یہ سخن گسترانہ باتیں سنیں تو سرے سے مشاعرہ ہی
بند کردیا، اس کے بعد یہ مناقشہ ایڈورڈز کالج میں منعقدہ ایک مشاعرے میں عروج
پر پہنچ گیا۔ وہاں دونوں طرف کے شعراء نے کھلم کھلا ایک دوسرے پر نام لے لے
کر چوٹیں کیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرحد کے نوجوانوں نے ابوا لکیف کیفی

سرحدی کو قصہ خوانی میں آلیا اور ہاتھا پائی اور لپاڈگی کا مظاہرہ ہوا پنجاب کے اخباروں نے اس واقعے کو خوب خوب اچھالا اب مقامی کالجوں میں بھی ادبی تنظیمیں بن گئیں اور ان کے مشاعروں میں شعراء نے آنا شروع کیا۔

تاریخ میں ایک مشاعرہ ایسا بھی ہوا جس میں یہ دونوں انجمنیں یکجا ہوگئیں اور انہوں نے مل کر ایک مشاعرہ کیا اس تاریخی مشاعرے کا انعقاد 24 جولائی 1936ء کو ایجرٹن ہسپتال پارک میں ہوا ایبٹ آباد کے بڑے نامور شاعر اور دانشور میرولی اللہ ایڈووکیٹ کی صدارت میں ہوا اس کی سرپرستی گورنمنٹ پریس پشاور کے باذوق منیجر اور ڈسٹرکٹ سکاؤٹ کمشنر مسٹر ایس ایف گرانٹ ایم بی ای نے کی اس مشاعرہ میں بھی مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی نے شرکت کی لیکن منتظم ان کا کلام نوٹ نہ کرسکے۔ اس مشاعرے کی ادارت پشاور کے مشہور ایکٹر اور شاعر اور بزم ادب کے کرتا دھرتا قمر علی قمر سرحدی نے کی، یہ مشاعرہ بزم ادب اور بزم سخن نے مل کر کیا اور اس کا اظہار اس کتاب میں بھی ہوا ہے جس میں اس مشاعرے کا حال اور شعراء کا کلام شائع ہوا ہے اس متحدہ مشاعرے کے لئے دی گئی طرح یہ تھی۔

بے وفا گر تو با وفا ہوتا

آخر میں نوٹ لکھنے کے بعد سیکرٹری نے "سیکرٹری متحدہ مشاعرہ" لکھا۔ مشاعرہ میں 32 اردو شعراء، چار فارسی شعراء نیز پانچ ہندکو اور پنجابی کے شعرا بھی تھے شعراء کے کلام پر مبنی جو کتاب شائع ہوئی اس کا نام لالہ زار رکھا گیا اس کتاب کی قیمت دو آنے تھی۔ چیدہ چیدہ اردو شعراء کا کلام (انتخاب) درج ذیل ہے۔

قاضی محمد عمر قضا

کان رکھ کر اگر سنا ہوتا
نالۂ نارسا رسا ہوتا
تھی کشش یہ مرے مقدر کی

قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے

انتخاب مشاعرہ ملاحظہ ہو

قاضی قضا

ملا پکوان پھیکا آسماں سے
کہ ملتا ہے یہی اونچی دکاں سے
چلے وہ لا مکاں سے ہم مکاں سے
ملے دونوں جہاں دونوں جہاں سے

محمد دلاور خان بیدل پشاوری مصنف دیوان سوز بیدل

کوئی میرا سا دل لائے کہاں سے
زمیں سے آسماں سے لا مکاں سے
تصور میں ترے اے غیرت گل
قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے

کیفی سرحدی

اٹھا اس روز ہی سے رنگ محفل
وہ اٹھ کر چل دیئے جب درمیاں سے

میرزا رضا حسین رضا ہمدانی (معتمد بزم سخن)

ہوا ثابت فسردہ استخواں سے
زمین بھی کم نہیں ہے آشیاں سے
میں وہ ناکام حسرت ہوں جہاں میں
سفینہ ڈوبتا ہے بادباں سے

مرزا امداد حسین بیگ بی اے

گلہ اور پھر زبان بے زباں سے
کوئی کیسے کرے اس دلستاں سے

آپ کا تیر کیوں خطا ہوتا

سید لعل شاہ برق

میکدہ گل کدہ بنا ہوتا
کھلکھلا کر جو تو ہنسا ہوتا
تیری بزم نشاط میں اے کاش
میں بھی دیوار قہقہا ہوتا

آغا محمد شاہ برق منشی فاضل کوہاٹی (سرپرست بزم سخن)

بخت میرا اگر رسا ہوتا
درد حق میں مرے دوا ہوتا
ہم کو حسرت کہ بندگی ہو نصیب
ان کو خواہش کہ میں خدا ہوتا

مرزا محمد سعید فارغ قادری

دل وہ یارب مجھے عطا ہوتا
درد و غم سے جو آشنا ہوتا
اک غم روزگار کیا کم ہے
کہ غم عشق دوسرا ہوتا

سید گل بادشاہ مخلص

درد اے عشق وہ دیا ہوتا
بڑھتے بڑھتے جو لادوا ہوتا
روز مجھ پر برستے ہو، اک دن
غیر کو بھی تو کچھ کہا ہوتا

اس کتاب یعنی لالہ زار میں بزم ادب کے تیسرے مشاعرے کی منتخب غزلیں بھی شامل ہیں یہ مشاعرہ 9 اگست 1936ء کو ہوا اس مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا۔

قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے

انتخاب مشاعرہ ملاحظہ ہو

قاضی قضا

ملا پکوان پھیکا آسماں سے
کہ ملتا ہے یہی اونچی دکاں سے
چلے وہ لا مکاں سے ہم مکاں سے
ملے دونوں جہاں دونوں جہاں سے

محمد دلاور خان بیدل پشاوری مصنف دیوان سوز بیدل

کوئی میرا سا دل لائے کہاں سے
زمیں سے آسماں سے لا مکاں سے
تصور میں ترے اے غیرت گل
قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے

کیفی سرحدی

اٹھا اس روز ہی سے رنگ محفل
وہ اٹھ کر چل دیئے جب درمیاں سے

میرزا رضا حسین رضا ہمدانی (معتمد بزم سخن)

ہوا ثابت فسردہ استخواں سے
زمین بھی کم نہیں ہے آشیاں سے
میں وہ ناکام حسرت ہوں جہاں میں
سفینہ ڈوبتا ہے بادباں سے

مرزا امداد حسین بیگ بی اے

گلہ اور پھر زبان بے زباں سے
کوئی کیسے کرے اس دلستاں سے

ثناء خوان محمد ہوں میں امداد
علاقہ ہے شہ کون و مکاں سے

مبارک دین اخگر تلمیذ برق کوہاٹی (ثم عشرت ملک)

وفورا اشک سے گلگوں ہے دامن
قفس بھی کم نہیں ہے آشیاں سے
کھلا ہے خاک ہو کر راز مجھ پر
تعلق ہے زمیں کو آسماں سے

جناب شہسوار ناطق درانی

ہزاروں پس گئے ، گردش میں اس کی
ترا کوچہ نہیں کم آسماں سے

جناب عبدالقیوم ضیاء پشاوری

بعید اتنا ہے وہ وہم و گماں سے
نگاہیں لوٹ آئیں لا مکاں سے
بکھرنے کو ہے زلف لیلیٰ شب
ضیاء روشن ہے خط کہکشاں سے

جناب جعفر علی جعفری سرحدی

وہ وارفتہ ہوں منزل کے نشاں سے
لپٹتا ہوں غبار کارواں سے
اٹھا دیتے جو پردہ درمیاں سے
دوئی کا نام مٹ جاتا جہاں سے

اس موقعے پر جب کہ اس مشاعرے کی صدارت بھی میر ولی اللہ صاحب نے کی جعفر علی جعفری نے یہ رباعی پڑھی

رشک نجم و مہ و پرویں ہیں مکین سرحد

مثل خورشید درخشاں ہے جبین سرحد
جعفری آج صدارت پہ ولی اللہ کی
کم ہے جتنا بھی کرے ناز زمین سرحد

اور پھر طرح مصرعہ پر اس ضمن میں چار اشعار پر مشتمل قطعہ بھی کہا

ستارہ اہل پیشاور کا چمکا
صدا خورشید نے دی آسماں سے
درخشندہ ہے کرسئی صدارت
ولی اللہ جیسے نکتہ داں سے

1938ء میں پشاور کے نوجوان شعراء نے ادبستان کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی اس کے بانیوں میں سید مظہر گیلانی ، رضا ہمدانی ، فارغ بخاری ، شمیم بھیروی ، مضطر تاتاری اور عشرت ملک تھے ، ادبستان کی بھی بزم سخن سے ٹھن گئی ، شعر میں تو ادبستان - دائرہ ادبیہ اور بزم سخن دونوں کے مقابلے میں ایک بہت ہی جدید ذہنی شعور اور انقلابی ارادے لے کر سامنے آئی لیکن بعد میں دائرہ ادبیہ اور ادبستان میں تعاون کی راہ ہموار ہو گئی اور براہ راست بزم سخن سے مقابلہ ٹھن گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بار پھر قصہ خوانی میں اسی مقام پر جہاں کہ ابوا لکیت کیفی سرحدی سے بے کیفی کا اظہار ہوا تھا برق کوہاٹی اور فارغ بخاری میں عملی دانتا کل کل ہو گئی یہ وہی مقام ہے جہاں ان دنوں 1930ء کے شہداء کی یادگاریں تعمیر ہو چکی ہیں ان حالات میں 1939ء میں ادبستان کی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں فارغ اور رضا دونوں نے پشاور چھوڑ کر گھومتے گھماتے کراچی کو آباد کیا۔ ایک عرصہ گزارنے کے بعد 1941ء میں واپس آئے تو انجمن ترقی اردو (سرحد) کی نئے سرے سے بنیاد رکھی اس مرتبہ ان کے ساتھ پرانے دوستوں کے علاوہ حکیم عبدالواسع اور حاجی نور الٰہی بھی شامل ہو گئے یہ دونوں شاعر یا ادیب نہ تھے لیکن ان کا ادبی ذوق بڑے بڑے شعراء و ادباء سے بڑھ کر تھا حکیم عبدالواسع تو انجمن

کے آخر تک خازن رہے ملک خدا بخش سابق سپیکر سرحد اسمبلی انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔

اسی سال شوکت واسطی گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے کرنے کے بعد پشاور ایڈورڈز کالج میں تاریخ میں ایم اے کرنے کے لئے داخل ہوا نام اس کا سید صلاح الدین تھا اور صلاحیتوں سے مالا مال۔ اسی کا تعلق شاہ آباد کرنال سے تھا ابتداء تو مظہر گیلانی سے اس کی عادت کے مطابق گالی کھائی اور رو دیا۔ پھر مظہر گیلانی نے ندامت کے ساتھ محبت کی نذر پیش کی تو وہ ہنسنے لگا اور مظہر کی آخری سانسوں تک اس کا یار غار رہا۔

آل انڈیا ریڈیو 16 جولائی 1942ء کا نارتھ سرکلر روڈ (موجودہ ہوٹل انٹر کان جو کبھی ریس کورس تھا کے بالکل مقابل) نئی عمارت میں دس کلو واٹ کے ٹرانسمٹر سے آغاز کیا گیا اس آواز کی نئی دنیا کا افتتاحی جلسہ بھی اسی دن ہوا اور اس میں پشاور کی اہم شخصیات کو مدعو کیا گیا اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری افتتاح کے لئے آئے اور انہوں نے صوبہ سرحد میں ثقافتی اور ادبی ترقی میں پشاور ریڈیو کے کردار پر روشنی ڈالی ان دنوں جگل کشور مہرہ (بعد میں مشرف بہ اسلام ہو کر احمد سلمان بنے) چودھری محمد اقبال، اشتین قطب اور افضل اقبال پروگرام ایگزیکٹو وار (War) جو بعد میں مختلف ملکوں میں سفیر پاکستان رہے اور 1994ء میں وفات پا گئے، ریڈیو کے کرتا دھرتا تھے۔

راقم الحروف اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک تھا اور انجمن ترقی اردو اور دائرہ ادبیہ کا رکن بھی تھا بہت سی اندرون خانہ نہایت پوشیدہ باتوں کا مجھے دست اول علم رہتا، جن میں سے چند ایک کا جس میں متذکرہ چپقلش بھی شامل ہے انکشاف اب اس مضمون کے سلسلے میں لازمی ہے کہ اب نہ وہ انجمنیں رہیں نہ وہ لوگ سوائے اللہ زندہ رکھے شوکت واسطی کے جو باہوش ہیں اور فارغ جو بے ہوش ہیں۔ یہ واقعہ تاریخ کا حصہ ہے اور تاریخ کے حقائق کو چھپانا بد دیانتی

ہے۔

اس نظم کا اثر ظاہر ہے ریڈیو والوں پر پڑنا ضروری ہے چنانچہ ریڈیو کے پروگرام کے حکام بھی اردو سبھا کے خلاف ہو گئے دوسرے ہی دن اس نظم کے جواب میں اسی زمین اور بحر میں ایک مسودہ پروگرام ایگزیکٹو جناب اشتین قطب کی میز پر پڑا ہوا تھا نام فرضی تھا لیکن لکھنے والے تھے سید فارغ بخاری کہ انہوں نے یہ مسودہ مجھے قطب صاحب تک پہنچانے کے لئے دیا تھا۔

قطب صاحب نے سید عبداللہ شاہ صاحب (اب مرحوم) کو بلوا بھیجا۔ وہ پشاور ریڈیو سے کبھی کبھار مذہبی تقریریں اور تلاوت کے پروگرام نشر کیا کرتے تھے ان کا اخبار الفلاح کے نام سے چھپتا تھا (اب بھی شائع ہوتا ہے) وہ ریڈیو اسٹیشن پہنچے قطب صاحب نے اس نظم کا مسودہ ان کے حوالے کر دیا دوسرے دن وہی نظم شائع شدہ بنڈل کی صورت میں قطب صاحب کی میز پر بھی چنانچہ مطبوعہ نظم شہر کے اہل قلم اور اخباروں وغیرہ میں تقسیم ہو گئی اس نظم کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

جنہیں کہیں جگہ نہ مل سکی سبھا سے آملے
وہ کوئی دم کٹا ہے کوئی پر کٹا ہے دیکھئے
کوئی چرن جیت ہے، لبھایا رام ہے کوئی
کوئی خواجگی کی ڈھول میں اٹا ہے دیکھئے

ان اشعار میں رائے بہادر دیوان چرنجیت لال جنہیں "سپروئے سرحد" کا خطاب بھی سبھا والوں نے دیا تھا اور لبھایا رام کا جوڈیشل کمشنر تھے ذکر ہے خواجہ محمد اشرف محکمہ تعلیم کی معروف شخصیت تھے یہ سب اردو سبھا کے مربی تھے اور ان کے گھروں پر جلسے بھی ہوتے رہے۔

اردو سبھا کو ہمیشہ اچھے نامور اور صاحب حیثیت لوگوں کا تعاون حاصل رہا ایسے لوگوں میں متذکرہ بالا ہندو شخصیتوں کے علاوہ عطاء اللہ جان مرحوم (سابق کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان و پشاور) فرید مچھلی شہری، پریم چند ہوڈا وغیرہ بھی تھے۔

ان سے پہلے ابوا لکیث کیفی سرحدی تضاد کا شکار رہے وہ کبھی ایک حلقے کے دوست بن جاتے اور کبھی ان کے دشمن بن جاتے وہ کسی ادارے کے ساتھی رہ کر نہیں چلے ، پروفیسر محمد موسیٰ کلیم ایک پڑھے لکھے اور باشعور صاحب قلم تھے ، اسلامیہ کالج میں پروفیسر رہے بعد میں کئی سرکاری کالجوں میں پرنسپل بھی رہے وہ گھوڑے کی سواری کے بڑے شوقین تھے اس شوق میں اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھے وہ ایک اونچی بیساکھی کے سہارے چلتے ، لیکن اس بیساکھی پر نشست بھی بنی ہوئی تھی جس پر اسلامیہ کالج کے طلباء نے یہ پہیلی بنائی کہ "وہ کون سا جانور ہے جو بیک وقت کھڑا بھی رہتا ہے بیٹھا بھی رہتا ہے اور چلتا بھی رہتا ہے"

پروفیسر موسیٰ کلیم نے ایک ادبی رسالہ طور کے نام سے جاری کیا ابو لکیث کیفی سرحدی نے بھی سفیر سخن کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا جس کی مالی اعانت اور سرپرستی سر صاحبزادہ عبدالقیوم کرتے تھے کیفی صاحب کا ایک خاص انداز تھا بڑی بڑی قلمیں رکھتے جو کانوں کو چھپاتی نصف رخسار تک پہنچائی گئی تھیں ، قراقل کی موٹی اور سیدھی دیواروں والی ٹوپی پہنتے ، شیروانی زیب تن کرتے - ہاتھ میں ایک عصا ضرور رکھتے - کچھ لئے دیئے رہنے کا انداز اور صورت تھی - گفتگو بڑی شائستہ کرتے ، نرم خوبصورت الفاظ جو معلوم ہوتا اساتذہ کے قصیدوں سے منتخب کئے گئے ہیں پروفیسر کلیم کا مجلّہ کلیم انہیں رقیب روسیاہ کی چال نظر آئی - چنانچہ انہوں نے دائرہ ادبیہ والوں کو ساتھی بنایا اور پروفیسر کلیم کے خلاف یہ نظم لکھی جو ان کے جریدہ سفیر سخن اگست 1936ء کے صفحہ 3 پر شائع ہوئی - عنوان تھا

کاغذی طور کے دراز گوش موسیٰ کی لن ترانیاں

طور پر حضرت موسیٰ جو گرے غش کھا کر
جلوہ یار پکارا ابھی دیکھا کیا ہے

نظم کا عنوان تھا

سنگ برپشت لنگ

ہوس کی کونڈی میں لے کے ڈنڈا رگڑ رہے ہیں یہ بھنگ دیکھو
جو دین و دنیا سے بے خبر ہیں وہ دائرے کے ملنگ دیکھو
فروتنی ہے برائے چندہ ، حصول مطلب کے ڈھنگ دیکھو
گدا گروں کی ہے یہ نشانی جبیں پہ داغ کلنگ دیکھو
چڑھے ہیں بانسوں پہ نٹ کی صورت بندھی ہیں رسی میں ان کی ٹانگیں
وہ تکیہ گاہوں میں جھولتے ہیں لئے دف و نے و چنگ دیکھو
ملی انہیں کرسئ صدارت ہے غنڈا پن میں جنہیں مہارت
خدا کرے کیوں نہ ان کو غارت ، یہ ان کی ناموس و ننگ دیکھو
یہ طور ٹکڑے ہوا کہ چمکا ، گری یہ بجلی کہ نور چمکا
ادب کے شیدائیو خدارا ذرا یہ اشعار لنگ دیکھو
عصائے موسیٰ کی حسرتوں میں بغل میں دابے ہیں چوب خضرا
ارادہ سیر طور دیکھو اور اس پہ یہ پائے لنگ دیکھو

اس نظم میں بظاہر تو محض موسیٰ خان کلیم ہی نہیں دائرہ ادبیہ کو بھی نشانہ ہدف بنایا گیا شاید کیفی صاحب کے سربازار رسوا کئے جانے کا سبب یہی نظم ہو - نظموں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا -

بزم سخن، دائرہ ادبیہ اور انجمن ترقی اردو کے بعد بزم علم و فن کا سرحد کی ادبیات میں بڑا اہم کردار ہے بات بزم علم و فن کی چل پڑی ہے تو اس حقیقت کی نشان دہی اہم ہے جو شاید کچھ لوگوں کو تلخ محسوس ہو۔ بزم علم و فن سید شوکت واسطی کا دوسرا نام ہے، اس لئے کہ بزم علم و فن اگر بعض دوسری انجمنوں کی طرح "جمہوری" ہوتی تو اب تک ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہوتی، جیسا کہ ذرا سی ڈھیل دینے پر اس کے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں ایک ٹکڑا جو "بزم علم و فن" کی ترقی کا مظہر ہوتے ہوتے رہ گیا وہ اس کے نام کی تبدیلی تھی، یعنی اسے شوکت واسطی نے "ادارہ علم و فن" کہلوانا پسند کیا، لیکن یہ نام شوکت واسطی کی اس دلی خواہش یعنی "ہمارا ادارہ ہمارا ارادہ" نہ بن سکی اور دوسروں کے ارادوں کی بھینٹ چڑھ گیا، اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا، اب یہ ملاحظہ ہو کہ بزم علم و فن کا آغاز کیسے ہوا۔ جیسے کہ اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں، شوکت واسطی ہر دور اور ہر حال میں ایک انجمن رہا اور ایک آدھ انجمن کو "زیب جیب" بنائے رہا اس "زیب جیب" کی ترکیب کی شان نزول یہ ہے کہ مارشل لاء کے کرتا دھرتا جنرل ضیاء لوگوں کے خیال میں "آمر" سہی لیکن ان میں ایک خوبی بھی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں اور اساتذہ کا احترام اسی طرح کرتے جس طرح ماضی کے علماء اپنے استادوں کا۔ صرف انہوں نے اپنے ایک بزرگ کا احترام نہیں کیا ذوالفقار علی بھٹو کا جس نے اسے تخت پر بٹھایا اور اپنا مقدر تختہ اسی کے ہاتھوں بنایا۔ جنرل ضیاء ہمارے سابق وفاقی وزیر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے شاگرد رہے ہوں گے، ان کے بڑھاپے میں انہیں اپنے استاد کی خدمت کا خیال آیا، ایک خطیر رقم ان کے حوالے کی، ان کے رہائشی بنگلے کا سرکاری کرایہ ادا ہونے لگا، ان کے سارے ذاتی ملازم سرکاری تنخواہ دار ہو گئے اور ان سے کہا گیا کہ وہ کسی نئے محکمے کی بنیاد رکھیں، انہوں نے سائنس کے ایک استاد میجر آفتاب حسن کا انتخاب کیا اور طے پایا کہ اردو زبان کی پرورش کے لئے ایک "بااختیار" محکمہ قائم کیا جائے سارے صوبوں سے دو دو نمائندوں کو اساسی جلسے میں نمائندگی کے لئے دعوت دی گئی صوبہ سرحد سے پروفیسر عبدالرؤف نوشہروی مرحوم کو جو پشاور یونیورسٹی میں کیمسٹری کے لیکچرر تھے اور ان کے علاوہ راقم الحروف کو اردو زبان کے نمائندے کے طور پر بلایا گیا اس جلسے میں میجر صاحب اور ڈاکٹر قریشی نے اس ادارے کے بااختیار ہونے پر زور دیا اور اس کا نام تجویز کرنے کو کہا گیا۔

اس سے پیشتر کہ ہم میں سے کوئی بھی ادارے کا کوئی نام تجویز کرتا، میجر آفتاب حسن نے خود ہی ایک نام پیش کر دیا "مقتدرہ قومی زبان"

اس وقت مقتدرہ کا لفظ ثقیل محسوس ہوا، بدقسمتی یا اتفاق سے میں نے اس نام کی مخالفت کی اور اسے مشکل قرار دیا اس پر میجر آفتاب حسن برافروختہ ہو گئے، حاشا و کلا اس نام کی ناپسندیدگی میں کوئی نیت بد یا کسی شخص یا کسی ادارے کا لحاظ یا خیال پیش نظر نہ تھا۔ محض ایک مخلصانہ تجویز تھی کہ تجویز ہم سے مانگی گئی تھی، میجر آفتاب حسن مصر رہے کہ یہی نام ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر قریشی مرحوم نے بھی اسی نام کو ترجیح دی، شاید وہ پہلے ہی اس نام پر صاد کر چکے تھے۔ سو ہم خاموش ہو گئے، لیکن میٹنگ ختم ہوتے ہی میجر آفتاب نے جھاگ اڑاتے ہوئے کہنا شروع کیا، "میری جیب میں ہر وقت کئی انجمنیں موجود رہتی ہیں" مجھے معلوم نہیں یہ بات کس نقطہ نظر سے انہوں نے کہی۔ میں آج تک اس معمے کو حل نہیں کر سکا۔ ہاں البتہ عملی طور پر انہوں نے مقتدرہ قومی زبان کے صوبہ سرحد کے نمائندے کے طور پر میرا نام قلمزد کر کے صرف اپنے کیمسٹری کے ساتھی عبدالرؤف نوشہروی کو ہی رکن رہنے دیا۔

بات چل رہی تھی شوکت واسطی کی ایک آدھ انجمن کو زیب جیب بنانے

کی اور یہ بات انہوں نے گارڈن کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی سے اپنا رکھی تھی ، کالج کے مجلّے کا اڈیٹر بن کر بہت سوں کو زبردستی ادیب اور شاعر بنا دیا - بظاہر حوا پرستی سے دور دور اور امرد پرستی کی دیواروں پر سے جھانکنے والے شوکت واسطی نے فارغ بخاری کے پشاور آنے کی دعوت تو قبول کرلی لیکن پشاور آکر اسے پہلے ہی دن سے وہاں کی فضاء میں اجنبیت نظر آئی جو آج تک برقرار ہے اور لڑکپن یعنی (Teen age) ٹین کے زمانے (پچھر دھات سے قطع نظر) سے ہی راولپنڈی کی سرزمین کو دل میں بسا لیا اور یہ پہلی نظر کی محبت آج تک برقرار ہے کہ انہوں نے پشاور کو آخر آخر الوداع کہہ کر اور پشاور کی کشتیاں جلا کر یعنی گھر بیچ کر پھر سے قدیم راولپنڈی کی جدید فضا یعنی اسلام آباد کو اپنا گھر بنا لیا - بزم علم و فن کی کہانی یا شوکت واسطی کی کہانی یوں ہے کہ یہ انجمن اس نے ہمیشہ زیب جیب اس طرح بنائے رکھی جس طرح بٹوہ ہو - اور دراصل یہ انجمن ان کا بٹوہ ہی ہے اسی بٹوے کو وہ انجمن پر لٹاتے رہے ، اپنے خون جگر سے اس کو سینچا اور اسے ملک گیر ہی نہیں عالمگیر بنا دیا ہے -

بزم علم و فن کی کہانی عرف شوکت واسطی کی کہانی کا سلسلہ یہ ہے کہ اس کے والد کا تبادلہ پشاور ہوگیا تو اس نے راولپنڈی کو خیرباد کہہ کر فارغ بخاری کی دعوت کو بیچ بنا دیا پشاور میں صدر کے علاقے کی مشہور گلی سرور گنج میں اس نے گھر لیا اور خود اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے ایڈورڈز کالج میں داخلہ لے لیا ان دنوں ایڈورڈز کالج اور اسلامیہ کالج میں بعض مضامین میں ایم اے کا اہتمام تھا ، وہاں سے پانچ طلباء میں صرف دو نے تاریخ میں ایم اے کیا ان میں شوکت واسطی نے سیکنڈ ڈویژن اور ایک ہندو تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا -

یہیں پشاور میں شوکت واسطی جو فارغ بخاری کے کہنے پر آیا تھا ، آتو گیا پر فارغ سے ماتھا نہ لگا جس کا اصل راز میں جانتا ہوں - فارغ اور شوکت دونوں کشتہ انا تھے ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں اور یہ تلواریں یکجا ہونے

کے بجائے رہیں تو بہ صورت ایک ساتھ - لیکن جس طرح تلواریں صرف ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہی ساتھ رہ سکتی ہیں یہ دونوں بھی مدمقابل تلواریں بن گئے البتہ شوکت واسطی کو تعارف میں گالی دے کر دوست بنا لینے والا اور فراغ دل سید مظہر گیلانی اپنی بے میل یا بے کدورت طبیعت کے باعث اس کے میل یا سنگم کا سبب بنا اور ان دونوں کا ساتھ اس وقت تک رہا جب تک مظہر زندہ رہا بلکہ مظہر کی وفات کے بعد بھی واسطی نے اس کی دوستی کو برقرار رکھا ہوا ہے -

پشاور کے قیام کے دوران یا فارغ التحصیل ہونے کے فوراً" بعد شوکت واسطی نے اردو سبھا (سرحد) کے نام سے ایک ادبی انجمن کا ڈول ڈالا ، ایک عجیب و غریب تاریخی حقیقت یہ ہے کہ پشاور ہمیشہ دو حصوں میں بٹا رہا ، شہر اور صدر کے علاقوں میں ------ صدر یا چھاؤنی کی بنیاد اس وقت پڑی جب انگریزوں کے ساتھ ان کی فوجوں کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے کفیل لوگ بھی آئے - راشن کے ٹھیکیدار ، فرنیچر والے ، سائیس ، خانسامے ، بیرے ، کپڑے والے ، درزی ، غرض زندگی کا ایک نیا دائرہ صدر میں وجود میں آیا ان میں پڑھے لکھے لوگ بھی تھے ، ان پڑھ بھی ، پڑھے لکھوں میں باذوق بھی تھے ، بد ذوق بھی ، اسی طرح ان پڑھوں میں بھی باذوق تھے - آج صدر میں آباد لوگوں کی اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جو انگریزوں کے ساتھ ان کی زندگی کی ضروریات کا سامان مہیا کرنے آئے اور ہمیشہ کے لئے رس بس گئے -

باذوق لوگوں نے یہاں ادبی انجمنیں بھی بنائیں ان انجمنوں میں بزم افکار 1926ء میں بنی اس کے کرتا دھرتا رسا بریلوی اور عزیز صہبائی خصوصاً" قابل ذکر ہیں بزم افکار نے بعض طرح مصرعہ کے مشاعرے بھی کرائے جن میں پہلی مرتبہ حفیظ جالندھری آئے اور انہوں نے درہ خیبر کی سیر کے بعد اپنی مشہور نظم درہ خیبر لکھی -

اردو سبھا یا شوکت واسطی میں بڑا جس تھا ، بزم افکار کی طرح اس نے

بھی سرحد میں معرکہ آراء مشاعروں کی طرح ڈالی - پشاور میں کل ہند مشاعرہ برپا کیا جس میں جگر مراد آبادی، علامہ تاجور نجیب آبادی، احسان دانش، روش صدیقی، عبدالحمید عدم، عبدالعزیز فطرت جیسی شخصیات نے شرکت کی - پھر رفاہی کام بھی کیئے -

یہ اس صدی کی چوتھی دہائی کے آغاز کا ذکر ہے جب بنگال میں زبردست قحط پڑا اور زین العابدین قحط بنگال کے مصور کے طور پر اور کرشن چندر اپنی تحریر ان داتا کے حوالے سے ملک گیر بلکہ عالم گیر سطح پر مشہور ہوئے، قحط کے تحت شوکت واسطی نے بھی ایک عظیم مشاعرے کا اہتمام کیا جس کے ذریعے قحط بنگال میں متاثرین کی امداد کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی اس مہم کو نیچا دکھانے یا ناکام بنانے میں تو فارغ بخاری کامیاب نہ ہوسکا لیکن اسی مشاعرے میں یہ رباعی لکھ کر پڑھی - یہ مشاعرہ ایڈورڈز کالج میں منعقد ہوا تھا، رباعی یوں تھی -

اغراض سے معمور ہے دھندا سارا
یکسر ہے خرافات پلندہ سارا
بنگال کے بھوکوں کو تو روٹی نہ ملی
خدام ادب کھا گئے چندہ سارا

پھر یہ وطیرہ شروع ہوا کہ اردو سبھا جتنے مشاعرے کراتی، انجمن ترقی اردو والے (اسے صرف "والا" کہنا مناسب ہوگا) ان کو درہم برہم کرانے کی کوشش کرتے، ان مشاعروں میں جن افراد کے ذریعے افرا تفری پیدا کی جاتی، فارغ سے منسلک ہونے کی وجہ سے میں ان کو جانتا ہوں - ان میں ایک بھرے بھرے جسم والا جوان محمد اشرف تھا جو فارغ کے مطب میں کمپونڈری کرتا تھا اللہ مغفرت کرے اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا - قمر سرحدی کی طرح اشرف نے بھی ایجرٹن پارک میں مخالفین کے مشاعروں میں سانپ بھی چھوڑے، پانی چھوڑ کر پارک کو ناقابل استعمال بنایا اور بارود کے گولے بھی داغے، شامیانوں کی رسیاں بھی کاٹی گئیں،

ان مشاعروں میں شورش کاشمیری بھی اس کا شکار ہوئے -

بنگال میں قحط پڑا تو اردو سبھا کے تحت بنگال کے قحط زدوں کی امداد کے لئے کل ہند کو مشاعرہ ہوا - فارغ بخاری اور شوکت واسطی میں اولین دوستی کے باوجود ٹھن چکی تھی چنانچہ فارغ نے اس مشاعرے پر پھبتی کستے ہوئے مندرجہ بالا رباعی لکھی -

اس کے بعد وہ مشہور نظم شوکت واسطی نے لکھی جو ریڈیو والوں اور ریڈیو مشاعرے میں پڑھنے والوں کے خلاف تھی اور اس کا عنوان تھا "یہ پشاور ہے" مکمل نظم ملاحظہ ہو -

وہ ریڈیو پہ شاعروں کا جمگھٹا ہے دیکھیئے
پروگرام خاندان میں بٹا ہے دیکھیئے
وہ جوتیاں گھسیٹتے پہنچ گئے ہیں اہل فن
نہ کار ان کے واسطے نہ پھٹپھٹا ہے دیکھیئے
وہ ایک تان چھڑ گئی وہ شور آفریں اٹھا
یہ ڈھول کس کے دست ناز سے پھٹا ہے دیکھیئے
فضا لرز اٹھی ہے اور تڑپ رہا ہے ریڈیو
یہ کون آکے میک فون پر ڈٹا ہے دیکھیئے
یہ پھسپھسی سی بندشیں یہ بے تکا سا قافیہ
کہاں پہ آکے زور شعر کا گھٹا ہے دیکھیئے
اف ایک لفظ داد کا ملا نہ بدنصیب کو
اگل کے اپنی نظم کون یہ ہٹا ہے دیکھیئے
ابھی تلک تو بزم میں جمود ہی جمود ہے
بجا چکے ہیں پانچ بین یہ چھٹا ہے دیکھیئے
بچونگڑوں میں چند مردوے ہیں کامیاب بھی

یہ بے مزہ ہے اور وہ شعر چٹپٹا ہے دیکھئے
جو اہل فن ہیں ان سے اس کی دشمنی مسلمہ
کدورتوں سے دل سٹاف کا اٹا دیکھئے
سوال کچھ سہی مگر جواب سب کا ایک ہے
تمام طوطیوں نے اک سبق رٹا ہے دیکھئے
نہیں قصور اہل کارواں کا کیوں بھٹک گئے
کہ میر کارواں ہی کوئی چرکٹا ہے دیکھئے

(بے اجازت آل انڈیا ریڈیو   قلندر سرحدی)

اردو سبھا کے بنیادی اراکین میں ایک مخدوم یوسف تھے - وہ سبھا کے دفتر میں رہا کرتے جو کالی باڑی پشاور صدر میں ایک لکڑی کی عمارت کی پہلی منزل پر واقع تھا - دوسرے حفیظ اثر تھے جو ایک مخلص اور نیک انسان تھے کمشنر دفتر میں تھے تیسرے دبنگ صاحب علم اور اردو پشتو زبان کے شاعر و ادیب حسین بخش کوثر غوریا خیل تھے -

شوکت اور ان کے مخالف ٹولے میں زبردست ٹھن گئی تھی جب ایڈورڈ کالج کا مشاعرہ ہوا تھا اور فارغ بخاری نے قحط بنگال والی رباعی پڑھی تھی اس کے بعد مشاعرے میں شوکت نے اس کا جواب دینا چاہا تو صدر مجلس نے انہیں روک دیا اس پر احتجاجاً" اردو سبھا کے سبھی اراکین مشاعرے سے واک آؤٹ کر گئے نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعرہ درہم برہم ہوگیا - منتظمین مشاعرہ کو اس پر بڑا تاؤ آیا اور وہ اردو سبھا کے واک آؤٹ کرنے والے شعراء کے پیچھے ہاکیاں لے کر دوڑے ' ان میں ہاکی کی مشہور شخصیت اور ایڈورڈز کالج کے عملے کے رکن مرحوم لالہ رفیق بھی تھے لالہ رفیق کو کوثر نے پکڑ لیا - کوثر کا احترام مد نظر رکھتے ہوئے وہ واپس چلے گئے دوسری مرتبہ نذیر مرزا برلاس کے شاگرد اس وقت چاقو لے کر شوکت واسطی پر حملہ آور ہوئے جب وہ ریس کورس کی نمائش کے مشاعرے میں پڑھ رہے تھے نذیر

مرزا برلاس کے ایک شعر پر شوکت واسطی نے آوازہ کس دیا ' یہاں اس آڑے وقت میں پھر شوکت کا دوست کوثر اس کی مدد کو پہنچا -

قیام پاکستان تک اردو سبھا ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے پیش پیش رہی - بلکہ چھوٹے چھوٹے ادبی کتابچے بھی شائع کرتی رہی - اس دور کی اشاعتی سرگرمیوں میں مرزا محمود سرحدی کے منتخب مزاحیہ اشعار پر مبنی کتاب ' سرحد کے شعراء کی منتخب غزلیں ' مخدوم یوسف کی علامہ اقبال کے اشعار کے تراجم پر مبنی (پیر ہندی مرید ہندی) اور شوکت واسطی کے گیتوں کے مجموعہ جل ترنگ کی اشاعت شامل ہے پیر ہندی مرید ہندی اردو سبھا سرحد کے شعبہ دارالاشاعت نے 1944ء میں یعنی اردو سبھا کی تشکیل کے ایک سال کے اندر شائع کی - قیام پاکستان کے بعد کسی اور حملے سے بچنے کی خاطر اردو سبھا کا نام تبدیل کر کے اردو مرکز رکھ دیا گیا -

فروری 1948ء میں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں شوکت واسطی کو لیکچرر کے طور پر متعین کردیا گیا وہاں چند دنوں بعد سید ضمیر جعفری بھی تبادلے کے گھوڑے پر سوار آپہنچے - دو شعراء آپس میں ملیں تو تان مشاعرے پر ٹوٹتی ہے ان میں سازش ہوئی کہ ایک شاندار مشاعرہ ایبٹ آباد میں منعقد کرانا چاہئے وہاں کے ایریا کمانڈر میجر جنرل نذیر احمد نے سرپرستی کی ' ایک اعلیٰ پیمانے کا مشاعرہ ہوگیا ایک نشست کی صدارت آزاد کشمیر کے اس وقت کے صدر چودھری غلام عباس نے کی ' دوسری کے لئے ابوالاثر حفیظ جالندھری کو خط لکھا گیا - مشاعرہ میں کشمیر فنڈ کے لئے امداد کی مہم شروع ہوئی اور پشاور میں قحط بنگال کے زخم خوردہ شوکت واسطی نے صاف دلی کو اصول حیات بناتے ہوئے بے خوفی کا مظاہرہ کیا اور 1948ء کے زمانے میں ساڑھے سات سو روپے کی تھیلی چودھری غلام عباس (مرحوم) کو پیش کردی گئی -

یہ پہلا کارنامہ تھا جو شوکت واسطی یا اردو مرکز نے ایبٹ آباد میں سرانجام دیا اسی پر اسے ایبٹ آباد میں باقاعدہ اپنی سبھا رچانے کا خیال پیدا ہوا

ماحول سازگار تھا ایک صاحب انور شبنم دل - نئی نئی باتیں ، نئے نئے شعر نکالنے کا جنوں رکھتے تھے - ان کے باذوق والد دل محمد فارسٹ انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے تھے ، ان کا سارا خاندان ہمہ خانہ آفتاب تھا ، علم و فن کا دلدادہ ، ادیبوں ، مصوروں اور فنکاروں کا عاشق ، انور جلال شمزہ اس کا بہت قریبی دوست تھا اور ایبٹ آباد میں اس کا ٹھکانہ انور شبنم دل کا گھر ہی ہوتا تھا شوکت واسطی سے اس کے ستارے ملے اور وہ دونوں چہل قدمی اور پکنکوں کے ساتھی بن گئے جب انجمن سازی کا خیال خوشبو بنا اور فضا میں پھیلا تو انور شبنم دل کے مشام جاں میں یہ خوشبو سمائی ، دونوں نے مل کر ایک لائحہ عمل تیار کیا - ایبٹ آباد میں سجاد احمد جان ایڈووکیٹ ایک محترم ہستی تھے - پاکستان کی سینیٹ کے موجودہ سربراہ جناب وسیم سجاد اسی ہستی کا چشم و چراغ ہے - ڈاکٹر مظہر علی خان کاکول ملٹری اکادمی میں پروفیسر کے عہدے پر متمکن تھے ڈاکٹر مظہر علی خان علامہ رشید ترابی کے چھوٹے بھائی تھے جو بعد میں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی کے سربراہ اور انگریزی ، اردو اور فارسی کے چیئرمین کے علاوہ ڈین بھی رہے - یہ اسی گھرانے کی صاحب علم و فضل شخصیت تھے جن کے ہاں حیدر آباد دکن میں میر انیس آیا کرتے اور مرثیے پڑھتے ، ڈاکٹر صاحب خود انیس کے عاشق صادق ان کے کلام کے شارح اور انیس کو شیکسپیئر کے معیاروں پر پرکھنے والی ہستی تھے - یاس یگانہ چنگیزی اور استاد قمر جلالوی ان کے ہاں کاکول جاتے اور ڈاکٹر صاحب کی ادبی ، دوستانہ اور انتظامی صلاحیتوں کی بناء پر ان سے محبت کرتے - پھر ایک سب سے اہم شخصیت جو پشاور میں اردو سبھا اور اردو مرکز کے سربراہ رہے ادب کے بہت بڑے مداح اور سرپرست عطاء اللہ جان خان بھی ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے ایبٹ آباد پہنچ گئے - سردار عبدالرب نشتر کے چھوٹے بھائی سردار عبدالغنی ڈی ایس پی کے طور پر وہاں تھے اگر سردار عبدالرب نشتر شاعر تھے تو سردار غنی ادب دوست ، شعر شناس اور درویش منش تھے - سید واجد رضوی جو حیدر آباد دکن میں سید قاسم رضوی کے دست راست

رہے وہ بھی ا . ٹ آباد آکر وہیں رس بس گئے وہ ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب ، مورخ ، عاشق رسول اور بلا کے شعلہ بیان مقرر ہیں ادب سے ان کا گہرا رشتہ تھا پھر وہاں عارف بٹالوی بھی تھے جو غلام احمد پرویز کے چھوٹے بھائی تھے - لیکن سب کا چھوٹا بھائی اور نرم و نازک کونپل یعنی محسن احسان بھی ہزارہ کے خزانے کا پانچواں سوار بن کر وہاں پہنچ چکا تھا ان سب نے مل کر اس انجمن کا ڈول ڈالا - اس کا ابتدائی نام ڈاکٹر مظہر علی خان نے تجویز کیا Art & knowledge forum اور اس انجمن تازہ کا ماٹو "الشرح لی صدری" طے ہوا - زر رکنیت دس روپے سالانہ رکھی گئی - پھر اسی انگریزی نام کو مشرف بہ اردو کرکے اسے بزم علم و فن دیا گیا -

پشاور میں خاطر غزنوی نے بزم علم و فن تشکیل دی - پشاور کے کمشنر جناب مسرت حسین زبیری اس کے سرپرست ہوئے اس دوران عطاء اللہ جان خان بھی پشاور کے ڈپٹی کمشنر بن کر پشاور آگئے اور بزم کی سرپرستی انہوں نے بھی سنبھالی ، اس کے سیکرٹری خاطر غزنوی ، نائب سیکرٹری مرحوم (جسٹس) کریم اللہ خان درانی مقرر ہوئے اور خان بابا خان جو بعد میں پاکستان کے سیکرٹری قانون بنے اس کے خازن مقرر کیئے گئے - پھر اس کی باقاعدہ صدارت محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر میاں مشتاق احمد خان کو تفویض کی گئی پشاور برانچ نے بڑے معرکے کے کئی پروگرام منعقد کیئے جن کا ذکر علیحدہ ہوگا کیونکہ اس وقت شوکت واسطی کی سرگرمیوں کا تذکرہ مقصود ہے -

ایبٹ آباد میں بزم علم و فن کے تحت بڑی اہم قومی ، ادبی شعری ، ثقافتی تقریبات منعقد ہوئیں ، جن میں مشہور رقاصہ مادام آزوری نے رقص پر ایک معرکہ آراء مقالہ پیش کیا اور اس کی تشریح عملی طور پر رقص کرکے کی گئی - انور جلال شمزہ کی تصویروں کی نمائش ہوئی جس میں سردار عبدالرب نشتر بھی شریک ہوئے ایبٹ آباد بزم کی صدارت جناب یوسف حیات کے حصے میں بھی آئی -

ایبٹ آباد میں ادبی دھومیں مچانے کے بعد شوکت واسطی پشاور آگئے ،

بزم علم و فن پشاور میں جان پڑ گئی وہ مزید فعال ہو گئی اور اس کی محفلوں میں اہل علم و فضل نے زیادہ سے زیادہ شرکت شروع کردی - فرنٹیئر کالج فار ویمن پشاور میں بعض لیکچرار باہر سے آئی تھیں ان لیکچراروں میں عذرا فیروز بخت اور نادرہ عزیز قابل ذکر ہیں انہوں نے اپنے ذوق کی بناء پر پشاور کی ادبی محفلوں میں شرکت شروع کردی -

پشاور بزم علم و فن کے مربیوں، محسنوں اور انتظامیہ کے اراکین میں جو شخصیات شامل ہوئیں ان کے اسمائے گرامی ہیں نادرہ عزیز، عذرا فیروز بخت، ڈاکٹر مظہر علی خان، محسن احسان (جو اب پشاور آچکے تھے)، شریف فاروق (جو اس زمانے میں سرحد میں جدید صحافت کو روزنامہ شہباز کی انقلابی قیادت میں آگے بڑھا رہے تھے) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جو پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے - چودھری محمد علی جو اس وقت سرحد کے ایڈووکیٹ جنرل تھے اور بعد میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے - ڈاکٹر شیر بہادر پنی جو محکمہ صحت کے سربراہ تھے ریڈیو پاکستان پشاور کے پروگرام اسسٹنٹ مجید مفتی جو بعد میں وفاقی سیکرٹری اطلاعات بنے -

پشاور میں خاطر غزنوی نے بزم علم و فن کے سیکرٹری کی حیثیت سے کئی یادگار تقریبات کا اہتمام کیا پہلی معرکہ آراء تقریب وہ محفل موسیقی تھی جو ایڈورڈز کالج میں منعقد ہوئی جس کے دو حصے تھے، پہلا حصہ لوک گیتوں پر مشتمل تھا اس میں لاہور اور راولپنڈی کے مشہور گلوکاروں انیقہ بانو، ثریا ملتانیکر، کوثر پروین، پشاور کے گلوکاروں میں عیدن بائی، پشاورا خان، قمرو جان، چشتی چمن جان اور وحید نیازی شامل تھے جبکہ سازکاروں میں مشہور سازندہ نواز منیر سرحدی کے والد استاد پذیر خان اور پٹیالے والے بھائی چھیلا بھی تھے اس محفل میں مہمان خصوصی پشاور کے کمشنر مسرت حسین زبیری (مرحوم) تھے، بزم کی ادبی محفلوں کے لئے شاہی مہمان خانے کا ہال منتخب کیا گیا جہاں ایک جلسے کا موضوع "مزاح" طے

ہوا اور اس کی صدارت پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کی جبکہ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے طنز و مزاح پر مقالہ پیش کیا پاکستان کے نامور صف اول کے مزاح نگار جناب سید ضمیر جعفری، نذیر احمد شیخ (مرحوم) اور جناب مرزا محمود سرحدی (مرحوم) نے اپنا مزاحیہ کلام پیش کیا -

پھر آغا خان بابا خان کی قیام گاہ واقع ایجرٹن پارک میں ایک محفل موسیقی منعقد ہوئی جس میں برصغیر کے مشہور مغنی بھائی چھیلا پٹیالے والے اور دلاری بائی نے شرکت کی، خاطر غزنوی نے ان دونوں گلوکاروں پر مضمون پڑھا - محکمہ صحت کے سربراہ ڈاکٹر شیر بہادر پنی کی قیام گاہ پر فوٹوگرافی کی ایک نمائش منعقد ہوئی جس میں حمید اللہ صراف (مرحوم) اور دوسرے فنکاروں کی تصویریں رکھی گئیں - یہ بنگلہ ریڈیو پاکستان کی عمارت سے ملحق نارتھ سرکلر روڈ پر واقع تھا پھر صوبہ سرحد کے ایڈووکیٹ جنرل (اور بعد میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر) چودھری محمد علی (مرحوم) کی قیام گاہ واقع ریس کورس گارڈن میں ایک تقریب منعقد کی گئی اس میں برصغیر کی فلموں کے نامور اداکار جینت (محمد ذکریا) نے شرکت کی ان کے ساتھ ان کے فرزند اور دور جدید کے مشہور اداکار امجد خان (مرحوم) جو اس وقت نوعمر تھے اور نوعمری میں نام پیدا کر رہے تھے اور جینت کے بڑے بیٹے مرتضیٰ خان بھی جو بھارتی فلموں کے ڈائریکٹر رہے، شریک ہوئے، اس محفل میں جینت نے اپنی فلمی زندگی کے بارے میں ایک گفتگو کی اور سوالوں کے جواب دیئے اس عرصے میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے عطاء اللہ جان بھی پشاور پہنچ چکے تھے - ان کے سبب ان محفلوں میں مزید جان پڑ گئی ان کی قیام گاہ پر بھی بعض محفلیں منعقد ہوئیں اس دور میں پشاور کا سارا پڑھا لکھا طبقہ بزم کے جلسوں میں شریک ہوتا، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی وجہ سے پشاور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج کے اساتذہ تشریف لاتے - گورنمنٹ کالج اور فرنٹیئر زنانہ کالج کی پروفیسر خواتین بھی شریک ہوتیں - ان میں مقامی اور دوسرے شہروں سے آنے والے باذوق حضرات

اور خواتین میں نادرہ عزیز، عذرا فیروز بخت، ڈاکٹر مظہر علی خان، حمید اللہ صراف، پروفیسر مس طباطبائی، احمد فراز، محسن احسان، روزنامہ شہباز کے چیف ایڈیٹر شریف فاروق، جناب میاں مشتاق احمد ڈائریکٹر محکمہ تعلیم، پروفیسر محمد احمد، پروفیسر حسن، پروفیسر محمد احد شمسی، اشنین قطب، حامد عزیز مدنی، ابو سعید قریشی، چودھری محمد اقبال، قدوس صہبائی، مسعود قریشی، اظہار کاظمی، مرزا ظفر الحسن، بشیر اسیر زیدی شریک ہوتے - شریف فاروق بزم علم و فن کی سرگرمیوں کی رودادیں شہباز میں اپنے مخصوص اور خوبصورت انداز میں شائع کرتے اجلاس میں سے ایک میں پروفیسر نادرہ عزیز صاحبہ نے ایک مقالہ پیش کیا اسوقت کے محکمہ تعلیم کے ایک اہم افسر کو ان کے محکمہ سے تشریف لانے والی کسی خاتون کا مقالہ پڑھنا ناگوار گزرا اور انہوں نے ایک سرکلر کے تحت بزم علم و فن کے جلسوں میں کالجوں کی خواتین کا داخلہ ممنوع قرار دیا - لیکن ان کی بدقسمتی کہ باذوق خواتین اس سرکلر کی پرواہ کئے بغیر بھی شامل ہوتیں ایک معرکے کا مشاعرہ میونسپل کمیٹی کے ہال میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت ریڈیو پاکستان کے اسٹیشن ڈائریکٹر قاضی احمد سعید نے کی اور اس میں پشاور کے سبھی شعراء نے اپنا کلام پیش کیا -

شوکت واسطی کی ادبی سرگرمیاں اس کے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہوئیں اتنے بڑے بڑے لوگوں کی دلچسپی اور بڑے پیمانے کی محفلوں کے سبب حاسد بڑے فعال ہوگئے اور یوں شوکت کوہاٹ، پارہ چنار، بنوں، مردان، سوات اور نجانے کہاں کہاں تبدیل ہوتا رہا، محکمہ تعلیم کے بعض زعما ان کے خلاف الزامات تراشنے کی مشین بن گئے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ وہ خود پشاور میں ڈائریکٹر تعلیمات نہ بن گئے لیکن اب ان کے خلاف سازشیں اوپر کی سطح پر پہنچ گئیں اور سیکرٹریٹ کے بعض بیورو کریٹوں کی شمولیت کے ساتھ ان پر ایک کاری ضرب کا باعث بن گئیں -

شوکت واسطی ایک شعلہ جوالہ رہا ہے وہ جہاں رہا ہے وہاں اس نے

ادب و شعر کی محفلوں کے گلستان سجائے ہیں چاہے وہ اردو سبھا کی صورت میں تھے اردو مرکز کی شکل میں - بزم علم و فن کے نام سے ادارہ علم و فن کے تحت یا کالج کی سرگرمیوں کے انداز میں - جہاں بدبیں لوگ اس سے پرخاش رکھتے تھے، وہیں اسے صاحب دل اور جوہر کی پرکھ رکھنے والے جوہری بھی ملے ان میں مخدوم یوسف اور حفیظ اثر سے لے کر مظہر گیلانی اور ڈاکٹر احسان اللہ خان تک - ایوب محسن سے محسن احسان تک، حاجی محمد یوسف جیسے خادم اور وفادار سے کمانڈر عزت بخش اعوان جیسے دبنگ، نڈر اور فن و ادب کے رسیا اور مربی تک، مسکین فیض الرحمان سے (جسٹس) کریم اللہ درانی تک، خواجہ محمد اشرف جیسے جید عالم، جغرافیہ دان، مورخ اور دوست نواز سے لے کر مظفر محمود قریشی جیسے بڑے بیورو کریٹ اور اندر سے رحم - شفقت محبت اور ریشم انسان بھی ملے اور ڈاکٹر مجبور خٹک جیسے حیوانات کو بھی بیمار نہ دیکھ سکنے والے سے ڈاکٹر خالد مفتی جیسے انسان دوست تک جو نشے کے مارے انسانوں کو پتھر سے ریشم اور زندہ رہنے کے قابل انسان بنانے والے ہیں ایسی شخصیات نے شوکت واسطی کے دشمنوں کو مزید جز بز کیا یہ شعلہ جوالہ اپنے ماحول کو ادبی روشنی دیتا رہا اس نے ہر دور میں ایک ادارے کا کام کیا - ہر دور میں کتابیں شائع کر کے اپنی انجمن کو واقعی فروغ و ترویج ادب کا باعمل ادارہ بنایا - جب مستقل پشاور آیا تو گل بہار جیسی حسین بستی میں اپنا پھول جیسا گھر بنایا جہاں شہد کا رس چوسنے والے منڈلاتے رہے کئی مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد ہوئیں پھر گل بہار تھانے کے سامنے ایک شاندار ہوٹل کی بڑی سی عمارت میں اوپر کی منزل کرایے پر لی اور بزم علم و فن کو ذرا وسعت دینے کے خیال سے اس کا نام ادارہ علم و فن رکھ لیا اور اس کے تحت کئی کتابیں جن میں نعتیہ مجموعے اور قومی شاعری یک جا ہیں شائع کئے - نیا پرانا لہجہ، دیپ جلے لہو لہو، خاصہ خاصان رسل وغیرہ - اردو زبان میں لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کے ہر زبان اور لہجے کے اہل قلم کی نگارشات کو اردو کا جامہ پہنا کر شائع کیا - اس تالیف کے

کام میں یوسف رجا چشتی نے پشتو، ہندکو تراجم کر کے اس کا ہاتھ بٹایا اور یوں سرحد کے شعرا کو ایک بار
کتاب کی تاریخ اور باغ بقا کی دلکش ہوا بخشی، حکومت کی طرف سے اس کی تین ہزار روپے سالانہ
گرانٹ بھی منظور ہوگئی مسکین فیض الرحمان اور کرنل عنایت اللہ ان کے ساتھی بن گئے۔ شوکت نے جیسا
میں نے شروع میں عرض کیا تھا انجمن کو اپنی جیب میں رکھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے اسے بنایا بھی ا
اس نے اپنے دوستوں کو اس میں ایک اہم مقام بھی دیا۔ اب ادارہ علم وفن کا ماٹو

ہمارا ادارہ، ہمارا ارادہ

بن گیا لیکن اس کو شوکت کے ساتھیوں نے جمہوری بنانے کی کوشش کی اور ہر چیز کو چاہے وہ کتابیں تھیں
چاندنیاں، الماری تھی یا کیش بکس، کرسیاں تھیں کہ صوفہ سیٹ، پلنگ تھا کہ قالین، لاؤڈ سپیکر تھے یا آپس میں
ٹکرانے اور ٹوٹ جانے والی کراکری، بستر کمبل، سردیوں میں گرمی بخشنے والا ہیٹر، چولہے تھے کہ فرج یا گوشت
پوست کے نرم و نازک زندہ لوگ، ان سب کو جمہوری یا اشتراکی بنا کر تقسیم کرنا چاہا، شوکت واسطی تو اس
قائل نہ تھا۔ غرض اہل دل کے سوا ہر چیز اغوا کر لی گئی اور یوں ادارہ کوچ کر گیا۔ اب اس کا دفتر ہوٹل سے
نقل مکانی کر گیا۔ اب شوکت واسطی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی پرانی اور ہمیشہ کی رفیق انجمن "بزم علم و
فن" کو پھر باہر نکالا، اسے جھاڑا پھونکا، برسوں کی گرد ہٹائی اور پھر سے سرگرم عمل ہو گیا کیونکہ وہ عملیات
ماہر ہے۔ ادارے کو اس نے بڑی محنت سے ایک قابل قدر ادارہ بنایا تھا۔ حکومت نے بھی اس کی کارکردگی
کی بناء پر اسے تسلیم کر لیا تھا اور اسے گرانٹ سے بھی نوازا لیکن شوکت واسطی کو حکومتیں کی گرانٹیں کبھی راس
نہیں آئیں۔ اس اصل مسمی صلاح الدین کی صلاحیتوں سے جل کر ہر دور میں لوگ اس کے خلاف ریشہ
دوانیاں کرتے ہی رہے۔ بزم علم وفن نے نئے سرے سے پھلنا پھولنا شروع کیا اور اس کی شاخیں اسلام
آباد، پشاور، ملتان، فیصل آباد، گجرانوالہ، میلسی، کوہاٹ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نوشہرہ، لاہور، کراچی، سیالکوٹ
میانوالی، لیہ، گوجرہ، سرگودھا، مظفر آباد، سوات، خانیوال، ایبٹ آباد، سمندری اور سمندر پار جدہ، مسقط اور
انگلستان میں بریڈفورڈ، لندن، لیڈز، کراولے، شیفیلڈ اور یورپ میں بون اور کوپن ہیگن میں کام کرنے لگیں
ہر جگہ جلسے ہوئے، مشاعرے برپا ہوئے اور بزم علم وفنون کا نام 1947ء سے پہلے کے اس برطانیہ کی طرح

چمکنے لگا جس طرح اس کا سورج غروب نہ ہوتا تھا ان شاخوں پر بہاریں لانے والے شوکت کے یار، ایوب
محسن، صادق بھٹی، نسیم لیہ (مرحوم)، سلیم اختر ندیم، خواجہ تنویر احمد، محمد فیروز شاہ، فاروق روکڑی، پروین
شاہین، جعفر شیرازی، رضا واسطی، سید واجد رضوی، افضل مرزا، محسن احسان، ڈاکٹر خالد مفتی جیسے لوگوں کی
تائید حاصل رہی۔ شوکت وہ چیز ہے کہ ہر قسم کی چیزیں بے مصرف اور نقصان دہ پالنے کا شوقین ہے اس نے
ایسے لوگ بھی پالے جس کی وجہ سے اس کی شہرت گہنا گئی لیکن ان لوگوں میں وفا کے موتی اپنی چمک دکھاتے
رہے۔ سرور سلیمانی اور ایوب صحرائی ایک صاحب علم وفن اور دوسرا محض ٹاٹ کا پیوند لیکن شوکت نے اس
میں ایسا ذوق بھر دیا کہ وہ اور کچھ کرتا یا نہیں ہر سال ایک کیلنڈر، کیلنڈروں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسے
چھپوائے تھے کہ ان پر اہل قلم کی تصاویر لگا دیں۔

پشاور سے شوکت بددل ہو گیا اور اسے وہاں ہر کونے کھدرے میں بچھو نظر آنے لگے وہ پشاور کو
خیرآباد کہہ کر اسلام آباد چلا گیا اور اب وہاں بزم علم وفن پنپ رہی ہے۔ مرحوم جسٹس سجاد احمد جان کے
فرزند ارجمند اور ان ہی کی طرح قانون سیاست اور ادب پر گہری نظر رکھنے والے وسیم سجاد سینٹ کی
چیئرمین کی حیثیت سے بزم علم وفن کے سرپرست بنے۔ بلیو ایریا میں واقع انٹر پرائز کا دفتر بزم علم وفن کا
مستقل دفتر بن چکا ہے۔ شاعر، ادیب، مرد و زن اس دفتر میں نرم و نازک فصلوں کے بٹیروں کی طرح یہاں
پائے جاتے ہیں۔ کلرک ٹائپسٹ موجود ہیں، کمپیوٹر پر کوئی خاتون انہماک سے کام کر رہی ہے۔ کتابیں دھڑا
دھڑ چھپ رہی ہیں۔ حمید شاہد جو شوکت کا شریک کار تھا اب اپنا الگ کاروبار کر رہا ہے۔ مجید امجد نام کا کوئی
نہ کوئی شخص ہر زمانے میں شوکت کا ساتھی رہا ہے۔ اب بھی ایک ساتھی ہے۔ اگرچہ وہ اپنا ساتھی آپ ہے۔
بزم علم وفن اب مستقل طور پر اسلام آباد کی ایک باوقار انجمن ہے۔ باقاعدہ ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد
کرائی ہے، ہر سال انعامات دیئے جاتے ہیں ان سب سے بڑھ کر شوکت واسطی نے اپنی سرگذشت حیات دو
جلدوں میں "کہتا ہوں سچ" اور "جھوٹ کی عادت نہیں مجھے" کے نام سے شائع کر دی ہیں۔ اللہ کرے
شوکت واسطی کا یہ کمرہ جو اردو سبھا، اردو مرکز، ادارہ علم وفن سے بزم علم وفن تک پہنچا ہے سدا آباد رہے۔

سرحد کی نئی نسل کی شاعری

پس ورق: دائیں سے بائیں: بشریٰ فرخ، بشریٰ اقبال، نرجس افروز زیدی، قدسیہ قدسی، عزیز اعجاز، ناصر علی سید، نذیر تبسم، مہدی حسن، انیلہ شاہین، عطیہ ہدایت اللہ، پروفیسر منور رؤف، زیتون بانو، جوہر میر، سردار خان فنا، غلام محمد قاصر، منظر نقوی، مشتاق شباب، سجاد بابر، یوسف عزیز زاہد، ساحر مصطفائی، یونس صابر، امجد بہزاد، اکمل نعیم، ڈاکٹر اسماعیل قمر

شاعری جوانی سے عبارت ہے بوڑھے شاعر تجربے اور مشاہدے کے بل بوتے پر آگے بڑھتے ہیں۔فن پر قدرت ان کی شاعری کا طرہ امتیاز بنتی ہے لیکن شاعری جذبے کا دوسرا نام ہے اور جذبہ جوانی کی روح ہے جوانوں کی شاعری جذبے کی شاعری ہوتی ہے' خلوص کی شاعری ہوتی ہے' قوت کی شاعری ہوتی ہے' ارتقا کی لگن کی شاعری ہوتی ہے۔

ہر دور میں نئی نسل نے جوانی کے حوصلوں کے ساتھ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ بھی دیا ہے اور پرانی قدروں کے خلاف جہاد بھی کیا ہے اس جہاد کیلئے زبان یا ملک کی تخصیص نہیں کی جاسکتی اردو زبان ہی کا جائزہ لیجئے یہ ہر دور میں نئی نسل' نئے خیالات' نئے انداز اور نیا شعور لیکر آئی' نئے تجربات نے ادب کا دامن وسیع تر کیا یہ دوسری بات ہے کہ روایت پسندوں نے ہر زمانے میں' ہر جگہ مزاحمت کا پرچم بلند کیا لیکن جیت سدا نئے اور گرم خون کا مقدر بنی۔

صوبہ سرحد ادب وشعر کے میدان میں ایک الگ دبستان اور الگ رنگ کا حامل رہا' یہاں پشتو' فارسی' اردو اور ہندکو زبان نے برصغیر میں لازوال شعراء کو متعارف کرایا تاریخ کی آغوش میں ایسے جواں فکر اہل قلم کی آواز سدا زندہ وتابندہ رہے گی پشتو میں پہلے معلوم شاعر امیر کروڑ (139ہجری) کی جوانی کے جذبوں سے بھرپور رزمیہ تعلّی کی شوکت' بیٹ نیکہ (چوتھی صدی ہجری) کے نئے عروضی دور کی غزل اور مثنوی کی پہلی پھوار' مرزا خان انصاری (گیارہویں صدی ہجری) کے عربی بحور کے تجربات اور پہلے مکمل دستیاب دیوان کی وسعت' خوشحال خان خٹک (گیارہویں صدی ہجری) کی رزمیہ' رومانی فلسفیانہ' صوفیانہ' اخلاقی' فطری اور حب وطن کی شاعری کی دھنک'

رحمان باباؒ کے تصوف کا رچا ہوا عوامی انداز، حمید بابا اور کاظم خان شیدا کے کلام کی نازک خیالیاں، پیر محمد کاکڑ کی علمیت کا سلیس انداز، حافظ الپوری کی طویل مترنم بحروں میں سلوک کی منزلیں۔
اور پھر چودھویں صدی میں امیر حمزہ شنواری کی بالکل نئے انداز کی غزل میں عشق کے مختلف روپ ان سبھی پشتو شعراء کے خیالات کی قوس قزح، فکر و نظر کا سامان پیدا کرتی ہے۔
چودھویں صدی میں اسلامیہ کالج کے قیام کے بعد تعلیم یافتہ نسل نے شعر و ادب میں مغربی ادب کے حسن کو سمویا اور خیالات کو حقیقت نگاری کا تابع بنایا۔
قیام پاکستان کے بعد کے پشتو شعراء نے ادب و شعر کی مختلف اصناف، فن کے نئے انداز اور پاکستان وطنیت کی نئی لہر کو موضوع سخن بنا کر نیا رخ متعین کیا۔
فارسی زبان مغل سلطنت کے ساتھ زوال پذیر ہونے لگی، لیکن ایران کے ۔ ے پاکستان کے دوستانہ روابط کی وجہ سے اس کا ادب زندہ ضرور رہا۔
ہندکو زبان نے بردا، مین، گاموں، رمضو جیلانی، سائیں احمد علی، عبداللہ، سیفی، وحشی، سیو قادری، استاد جوش، مضمر تاتاری اور رضا ہمدانی پیدا کئے۔ ہر ایک نے اپنی جوانی میں ہندکو ادب کو نئی آب و تاب بخشی۔
سرحد میں اردو کے اہل قلم نے اپنے اپنے دور میں نئے تقاضوں کا ساتھ دیا۔ نئی ادبی تحریکوں کو سینے سے لگایا۔ دہلی، لکھنؤ، رامپور اور دوسرے مراکز کی خصوصیات اپنے پورے حسن کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر معز اللہ مومند کا کلام ولیؔ کے کلام سے ملا دیا جائے تو تخصیص مشکل ہو جاتی ہے۔ وہی زبان وہی الفاظ کی تراش خراش، وہی رنگ وہی لہجہ۔
قاسم علی خان آفریدی، میر حسن، میر اثر اور انشاء اللہ خان انشا کا ہمعصر تھا، آفریدی کے اشعار اپنے دور میں جدت کے حامل ہیں۔
بیسویں صدی کا ابتدائی دور اس لحاظ سے اہم ہے کہ مغربی علوم کے دروازے مشرق پر بھی وا ہو گئے۔ انگریزی تعلیم، یورپی ادب کو برصغیر میں متعارف کرانے کا باعث بنی، یوں مغرب کی شعری

روایات اور جدتوں نے اردو زبان میں بار پایا۔ نئی اور پرانی اصناف کے ساتھ ساتھ مغرب کا اسلوب بھی مقبول ہوا۔
سرسید، حالی، آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی اس نئی لہر کو قبول کرنے والوں کا ہراول دستہ تھا۔ پھر شرر، سرشار، نظم طباطبائی، وحید الدین سلیم، مرزا ہادی، رسوا اور ضامن کنتوری نے نئے تجربات کو اپنایا اور پھیلایا۔ اس کے بعد کی نئی نسل میں عظمت اللہ خان، اختر شیرانی، تصدق حسین خالد، میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، مختار صدیقی، منیب الرحمان، سلام مچھلی شہری، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، فکر تونسوی، حمایت علی شاعر اور جیلانی کامران نے یکے بعد دیگرے شعر میں ہیئت کے تجربوں کے ساتھ نئے لہجے، نئی آواز کے ساتھ نئی باتیں بھی کیں، یہاں تک کہ غزل کو بھی ایک نیا آہنگ بخشا گیا، فیض، مجاز، ندیم، ناصر کاظمی، ضیاء جعفری، قتیل اور فراز غزل کو تازگی اور رنگ بخشنے والی تین نئی نسلوں کے نمائندے ہیں صوبہ سرحد ہر دور میں ان نئی تحریکوں کا ساتھ رہتا رہا۔
سرحد میں جدید شاعری کے ابتدائی دور میں جو بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے شعر و ادب کے پرستاروں کا ایک پورا گروہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اہل قلم کسی ایک شاہر یا ادیب کی قیامگاہ کو مستقل ٹھکانہ بنا کر یکجا ہوتے تھے۔ اور پھر یہ مقام ایک مستقل دبستان بن جاتا تھا یہی وہ دور ہے جب باقاعدہ طور پر مشاعروں کا آغاز ہوا اور بقول سید فارغ بخاری نیم شعوری کیفیت اشعار میں جھلکنے لگی دراصل اس نیم شعور یا مکمل شعور کو ہم نئی نسل کا جدید رجحان کہہ سکتے ہیں اور یہی وہ دور ہے جس میں سائیں احمد علی اپنی علمیت، زور طبیعت، حسن بیان اور اردو، فارسی اور ہندکو پر مکمل دسترس کے باعث قافلہ سالار کی صورت میں اس راستے پر رواں دواں نظر آتے ہیں۔
غلام حسین مسگر کی دکان اس دور کے شعراء کا مستقل ٹھکانہ تھی اور پشاور کے وہ شعراء جو برصغیر کے مختلف شہروں میں کسی نہ کسی سبب سے چلے گئے تھے ایک ایک کر کے واپس آنے لگے تھے اور اس حلقے میں شریک ہوتے گئے۔
1900ء میں سید جگر کاظمی کلکتے سے آئے، 1903ء میں مستری خالص مکی بمبی سے واپس اپنے شہر

پہنچے۔ 1907ء میں قاضی محمد عمر قضا کرنال سے لوٹے' 1908ء میں لعل شاہ برق دلی سے واپس آئے یہاں دلاور خان بیدل پشاور اور فاتح شاہ نشتر نے بھی ان کا ساتھ دیا' یہ وہ دور تھا کہ شعراء کے شاگردوں کی ایک کھیپ ہوا کرتی تھی ان سب جواں ہمت اور نئے ذہن کے لوگوں نے سرحد کی شعری فضاء میں گرما گرمی پیدا کردی۔

غلام حسین مسگر ہی کی دکان میں بزم سخن کا قیام عمل میں آیا' اس انجمن میں شعری ذوق بڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ دوسرے شعراء وادباء نے بھی ٹھکانے بنائے ان میں جعفر علی جعفری اور قمر سرحدی قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں میر عباس' امانت علی امانت' سردار عبدالرب نشتر' عیش فیروز پوری' رفعت بخاری اور پھر ذوالفقار علی بخاری' عبدالرشید برگ' رسا بریلوی اور عزیز صہبائی جواں عمری اور جواں فکری کے مظاہرے کرتے رہے۔ ادھر ایبٹ آباد کے میر ولی اللہ کی دھاک سارے برصغیر میں بیٹھ چکی تھی۔

نذیر میرزبرلاس بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کی نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں' طرح نو صوبہ سرحد میں نئی نظم کا آغاز ہے' اسی زمانے میں دائرہ ادبیہ کے لکھنے والے ڈاکٹر برلاس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے' اس جوان نسل کے نمائندوں میں ضیاء جعفری' فارغ بخاری' رضا ہمدانی' مظہر گیلانی' مرزا محمود سرحدی' قتیل شفائی' آذر سرحدی' جمیل راز اور شوکت واسطی قابل ذکر ہیں' شعراء کی یہی وہ کیپ ہے جو نیا ذہن لیکر پرانی ہوتی ہوئی بزم سخن کے مدمقابل خیالات کی ترویج کرنے لگی۔

ضیاء جعفری نے غزل اور رباعی کی اصناف میں سرمستی اور والہانہ پن سمویا' رندی اور عشق کی کیفیتیں ان کی غزل اور رباعی دونوں کی خصوصیات ہیں ان کی غزل اور رباعی میں فنی قدامت سے قطع نظر نئے ذہن کی تمام جواں کیفیتیں ملتی ہیں۔

آہٹ پہ ہیں کان ابھی تک کیوں اے کوئے جانانہ — میرے بعد نہیں آنے کا شاید کوئی دیوانہ

پچھلے پہر جب ڈھل جاتا ہے چاند مرے پیمانے میں — ہر شے میں اک کروٹ لیکر جاگ اٹھتا ہے میخانہ

رباعی ملاحظہ ہو۔۔

توبہ یہ گھٹاؤں کی سیاہی توبہ — توبہ یہ فضا لامتناہی توبہ

وہ جام بکف' زلف بدوش آئے ہیں — توبہ سے میں باز آیا الٰہی توبہ

مضمر تاتاری امی شاعر ہونے کے باوجود خیالات کی تازگی اور بلند آہنگی کے جوہر دکھاتے رہے ان کی اردو نظمیں بہت جدید اور بہت زوردار ہیں' ہندکو زبان میں وہ آج بے بدل شاعر ہیں' لیکن دائرہ ادبیہ اور ادبستان کے ادوار میں مضمر کی جوانی نے انقلابی شاعری کی مشعلیں جلائیں اس کے ہاں نئی اور دلکش تشبیہات اور حیران کن ترکیبوں کے ساتھ موضوع پر مکمل گرفت نے ادبی دنیا کو چونکا دیا۔ سید مظہر گیلانی' اختر شیرانی کے مکتب کے شاعر تھے۔ سرحد کے روایت پرست ماحول میں اختر شیرانی کے مشرب کو اپنایا اور اس کی طرح عورت کا نام لیکر شعر میں مخاطب کرنا جوانی کی جرات آزمائی تھی اور یہ اولیت مظہر ہی کے حصے میں آئی۔ مظہر گیلانی نے سرحد میں رومانیت کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ وہ جوانی کی رنگینیوں سے پوری طرح لذت اندوز ہونے اور زندگی رس نچوڑنے کا قائل رہا' اس کی غزل میں شرابی کیفیتیں اور جوانی کے نغمے اپنے پورے حسن اور شدت سے ملتے ہیں۔

تیرے ہی احترام میں ابر حسین اٹھا — جان شراب جھوم ذرا ساتگین اٹھا

پی ایک ساتگیں مگر افوہ وہ نگہ — ایک پھول اٹھا چمن سے مگر بہترین اٹھا

جو مے سے ہم کبھی غم دور کرنے لگتے ہیں — وہ چاند بن کے سبو سے ابھرنے لگتے ہیں

قتیل شفائی نظم' غزل اور گیت کا شاعر ہے' قتیل نے عنفوان شباب میں اپنی شاعری کو جوانی کی رعنائیوں سے بھر دیا' اس کے گیتوں میں رم جھم کے نغمے اور ہریالی کے لہریں فردوس گوش اور فردوس نظر بنتی ہیں' اس کی نظم میں زندگی تلخ' ترش اور شیریں تجربے انگڑائیاں لیتے نظر آتے ہیں اور اس کی غزل میں ایک کھنک اور ترنم رقص کرتا محسوس ہوتا ہے نغمگی اس کی شاعری کا عنوان ہے۔

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں — کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

قتیل نے برصغیر میں فلم کیلئے سب سے زیادہ نغمے لکھے ہیں۔ اس کے فلمی گیتوں میں بھی ادبی شان پائی جاتی ہے۔ قتیل نے نظم اور گیت دونوں اصناف میں کامیاب تجربے کئے ہیں۔

مطربہ اس کی نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اس کی جوانی کے ایک تلخ تجربے کا آئینہ دار ہے، قتیل کے شاعری عورت، عشق اور نغمگی کے چھناکوں میں لپٹی ہوئی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر ایک امن پسند، حسن پسند اور ترقی پسند انساف ہے وہ دنیا کو جنت کا نمونہ دیکھنے کا متلاشی ہے۔

رضا ہمدانی نے ہر شعری صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کی غزل ایسے نرم و نازک جذبات کی حامل ہے، جو صرف جوانی کی دین ہے۔ رضا کی غزل میں نئے لہجے کی جدت اور نیا آہنگ روایت کے حسن کے ساتھ ملتا ہے۔

دمک اٹھی ہے سیہ رات کی جبیں کیلئے — یہ روشنی کہیں بجھتے چراغ کی تو نہیں
غم کتنا جانگسل ہے، مگر غم ہے کیا کریں — زخم حیات کا یہی مرہم ہے کیا کریں

شوکت واسطی گیت اور غزل کا شاعر ہے اس کے گیتوں میں جلترنگ بجتے سنائی دیتے ہیں۔ گیت اصل میں ہندی شاعری کی ایک صنف ہے اور اسی لئے گیتوں میں ہلکے پھلکے الفاظ ہی اس صنف کو مجروح ہونے سے بچاتے ہیں۔ شوکت کو اس رمز کا عرفان حاصل ہے اور اس لئے اس کے گیتوں حسن کی رنگینیاں اور جوانی کی امنگیں ملتی ہیں لیکن بعض اوقات اس کے گیت اردو سے زیادہ ہندی کے نظر آتے ہیں۔

یہ رت ہر ناری کو بھائے — تو بھی ناچے تو بھی گائے
میرا ہرودوباجائے — تو اور میں بچپن کی کھیلی
چھیڑ نہ ساون گیت سہیلی

شوکت کی غزل میں تلخ تجربوں کی چوٹیں نظر آتی ہیں، یوں بھی تجربہ نئی غزل کی اساس ہے، اگر شوکت ادبی سیاست میں نہ پڑتا تو اس کا فن اور زیادہ نکھرتا، ہر بات زندگی میں بڑی دیر سے ہوئی
منزل پر آلئے تو ہمیں ہم سفر ملے۔

روش روش پہ چمن کے بجھے بجھے منظر — یہ کہہ رہے ہیں یہاں سے بہار گذری ہے

مجید امجد ایک نئی ٹھان لیکر ابھرا، اس کی نظموں میں جوانی کے ترانے، موسموں کے رنگ، مناظر فطرت کی دلکشی اور دیہات کی کھلی فضا کی خوشبوئیں رچی بسی تھیں، دور کاغان کے ایک گاؤں میں وہ دھان کا کھیت۔

جسکے ہر رقص میں لہراتے ہوئے سانپ ہزار — گھاٹیاں! جیسے فلک پر بھی بسنت آئی ہو
آسماں! جیسے سمندر پہ شگوفوں کی بہار — جس طرف بہاری کی قیامت رقصاں
سرخ ململ کے دوپٹے کا حیا ساز ابھار — وہ دوپٹے میں دھڑکتا ہوا ایک حسن شباب
وہ کسی نبض میں ڈھلتا ہوا موہوم سا پیار — اس نے گوپھن سے مرے ماتھے پر پتھر مارا

مجید امجد نے اور کئی دلکش نظمیں لکھ کر چند ہی دنوں میں سرحد کے شعراء میں اپنا مقام پیدا کر لیا لیکن حادثے نے اس جواں مرگ کی تخلیقات سے سرحد کو محروم کر دیا۔

صوبہ سرحد میں اس کے بعد کی نسل کے شعراء میں مجید شاہد، حفیظ اثر، خاطر غزنوی، فرید عرض، منظور عارف، الطاف پرواز اور ایوب صابر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

دائرہ ادبیہ کے بعد سرحد میں دوسری اہم انجمنوں میں ادبستان انجمن ترقی اردو اور ترقی پسند مصنفین ہیں جن میں نوجوانوں نے تربیت پائی، ان میں یہی شعراء پیش پیش رہے۔ ان شعراء نے نئی تحریکوں کا ساتھ بھی دیا اور نئے تجربات میں بھی پیش پیش رہے۔

مجید شاہد نے غزل میں ایک مقام حاصل کیا اور اپنی شاعری کو غزل تک محدود رکھا، اس کی غزل، روایت میں جدت اور جدت میں روایت کے امتزاج کی علامت ہے، اس کی غزل میں فلسفیانہ رنگ نمایاں رہتا ہے، اس کا رنگ پختہ اور خیالات کے گہرائی کے حامل ہیں۔

کہکشاں تو غبار منزل ہے — ہم ابھی راستہ نہیں بھولے
ہٹو ہٹو پردہ نظر سے جمال دکھلاؤ دور جا کر — مری نگاہوں کو فاصلہ دو چھپے ہوئے قریب آکر

خاطر غزنوی کی شاعری کا آغاز گیتوں سے ہوا، گیتوں کو اس نے اس کی اصل صورت میں دیکھنا

پسند کیا ہے' یعنی عورت کے جذبات کی ترجمانی اور ہلکے پھلکے نرم و نازک الفاظ کا انتخاب خاطر نے گیت' نظم' غزل' قطعہ' نعت' منقبت' مرثیہ و سلام ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے ہر صنف میں وہ جدیدیت اور تازگی کو اہمیت دیتا ہے سلام میں بھی اسے کربلا کے سانحے کے حوالے سے عالمی امن کا احساس رہتا ہے۔

برف بے رنگ ہے' منقار میں زیتون کی شاخ　　ایک پرندہ ہے کہ ہر دور میں مارا جائے

غزل میں اسے اپنے احباب کی ستم رانیوں سے گلہ رہا ہے اس کی بیشتر غزلوں کے اشعار کو موضوع شکوہ احباب ہے۔۔

گرز کرہے وفا کا تو معذور جانئے　　ہونٹوں پہ آ گئے ہیں کئی نام دوستو

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے　　لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

نظم میں جنسی موضوعات کے ساتھ ساتھ اس نے ترقی پسندانہ خیالات کا دامن نہیں چھوڑا' تجربہ اور مشاہدہ اس کی نظموں میں آپ بیتی کا انداز پیدا کرتا ہے۔

فرید عرش نے بھی سبھی اصناف شعر و نثر میں طبع آزمائی کی' لیکن اس کی غزل میں نئے دور کی روشنی اور نئے شعور کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔

عرش پرانی باتیں چھوڑو　　بدلے ہیں انداز غزل کے

دیوانے پھر دیوانے ہیں　　رکھ دیں گے ماحول بدل کے

نگاہ فکر کے پیدا نئے مقام کرو　　زمانہ رنگ بدلتا ہے احترام کرو

سرحد کے جدید تر نسل کے نمایاں ترین شعراء میں احمد فراز' محسن احسان' جلیل حشمی' ایوب صابر' مسعود انور شفقی' اختر جعفری' تاج سعید' یوسف رجا چشتی' عابد علی سید ہیں ان میں سے اکثر شعراء بین الاقوامی اور قومی شہرت کے حامل ہیں۔

احمد فراز نے اپنے نئے رنگ' خیالات کی اپج اور اسلوب کی تازگی کی وجہ سے صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔

فراز نے غزل اور نظم دونوں میں انفرادیت پیدا کی ہے۔ اس کی غزل عشق سے عبارت ہے عشق ہی فراق و وصال کی لذتیں بخشتا ہے' عشق ہی وفا اور جفا کو جنم دیتا ہے' عشق ہی گلیوں گلیوں بھٹکنے پر مجبور کرتا ہے' اور عشق ہی کے سبب رقیب اور دشمن پیدا ہوتے ہیں عشق کے یہ سارے رنگ فراز کی غزل کا حسن ہیں۔

یوسف لودی نے آزاد اور نثری شاعری کے دیپ جلائے ان کی ایسی شاعری کا مجموعہ موم کے پتھر کے نام سے شائع ہوا۔ نثری شاعری کا سرحد میں یہ پہلا تجربہ تھا۔

محسن احسان نے بھی شعر کی ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے' لیکن اس کی غزل میں ایک نئی اور جواں کیفیت ملتی ہے' محسن کی غزل بھی محبت کی دلفریبیوں کا آئینہ ہے لیکن اس نے غزل میں جدیدیت کے سارے پہلو سموئے ہیں منظر نگاری' حقائق' دوسری' دشمنی' خزاں' بہار' رنگ' خوشبوئیں۔۔۔ لیکن ان ساری کیفیتوں کے پس منظر میں تجربہ روشنیاں بکھیرتا نظر آتا ہے۔

محسن نے دل پر چرکے بھی سہے ہیں' قربانیاں دینے کا سلیقہ بھی اسے آتا ہے وفا کے وعدوں کے باوجود وہ ہرجائی بھی بنتا ہے فلسفیانہ موشگافیوں کے مزے بھی لیتا ہے' غم بھی اسے عزیز ہے' غرض تجربہ اور مشاہدہ اس کے موضوعات کو جاندار بناتا ہے۔

اک اک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے　　ہائے کیا لوگ مرے حلقہ احباب میں تھے

جلیل حشمی....... رہبانیت پسند ہے' وہ زندگی کے سرد و گرم چکھ کر بھی گوشہ نشینی کو ترجیح دیتا ہے' جلیل حشمی کے ہاں نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کی ڈکشن' فیض کی شاعری کا نرم اور تیکھا انداز اور ناظر کاظمی کی نثریت ملتی ہے' غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں اصناف میں بلند پایہ شاعری کی ہے لیکن بھنور لہو کا کے نام سے اس نے مرثیہ نگاری میں جدت کے دروازے کھولے۔

شرر نعمانی ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا' اصل کا پٹھان آباء رام پور میں کئی پشتیں اول جا بسے' شرر قیام پاکستان کے ساتھ پاکستان آ گیا اور اپنے وطن میں پھر سے آباد ہو گیا۔ شرر نے غزل' نظم' رباعی

بھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن غزل اس کا خصوصی میدان تھا، اس نے پشتو ادب سے خوبصورت تراجم بھی کیے۔ شرر بہت ہی اچھے دل کا آدمی تھا، لیکن دل نے اس کی زندگی کا ساتھ نہ دیا۔

پرتو روہیلہ اور ثاقب حزیں اس دور کے شعراء ہیں۔ پرتو دوہے اور غزل کا شاعر ہے، ثاقب حزیں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، شمس الزمان شمس نے اپنی شاعری کو غنائی رنگ دیا۔ ط خان نے مزاح میں نام پیدا کیا۔

مسعود انور شفقی کی شاعری پر ریڈیو اور ٹی وی ڈرامہ، صحافت، بزنس اور اشتہار بازی چھائی ہوئی ہے اگر وہ صرف شاعری یا صرف ڈرامہ یا صرف صحافت پر توجہ دیتا تو بیکراں ہو جاتا، لیکن اس کے باوجود وہ ان سب میدانوں میں ایک ایسے ہنرمند کی خصوصیت رکھتا ہے کہ جس کے فن کے سبب اس کے گرد مداحوں کا حلقہ وسیع رہتا ہے۔ مسعود انور شفقی نے شاعری میں غزل، نظم، قطعہ، غنائیہ وغیرہ ساری اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن وہ غزل میں نمایاں نظر آتا ہے اس کی غزل ہلکی پھلکی، مترنم اور رواں دواں ہوتی ہے الفاظ کی سلاست اور عام فہم انداز اس کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے، لیکن اس کی شاعری کا ایک اہم پہلو مزاح ہے، مرزا محمود سرحدی سے دوستی اور قرب اور اخباری ضروریات کے مدنظر وہ حالات حاضرہ، معاشرے کی خرابیوں اور شہر آشوب کو اپنے مزاح کا موضوع بناتا رہا ہے کم لوگوں کو علم ہے کہ مزاحیہ شاعری کے مجموعے "قینچیاں" کا پاکٹ مار مسعود انور شفقی ہے، اس کی دوسری منتخب طنزیہ اور مزاحیہ نظموں کا مجموعہ "رات اور الو" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

کوہاٹ کے مشہور اہل قلم جسٹس کیانی، میر عبدالصمد، عزیز اختر وارثی، آذر سرحدی، احمد فراز کی صف کا ایک شاعر ایوب صابر خصوصی طور پر قابل ذکر ہے وہ بھی مسعود انور شفقی کی طرح صحافت اور ادب کے امتزاج کو اپنا رہا ہے، بانگ حرم، شہباز اور مشرق کی کالم نگاری میں اس نے نام پیدا کیا۔ کالم نگاری اس نے چلم کش کے نام سے کی، اس نے پشتو اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی

اور مقبولیت حاصل کی۔ اردو شاعری میں طنز و مزاح کو بھی اپنایا، غزل کو بھی اس نے حرز جاں بنایا اور نظم بھی لکھی، طنز و مزاح میں اس کے آٹوگراف نئے انداز کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں، غزل میں اس نے ترقی پسندانہ رجحانات کی تصویر کشی کی۔

اس دور کی نئی نسل میں ایک نمایاں نام جوہر میر کا ہے، اس نے بھی صحافت کو پیشے کے طور پر اپنایا، لیکن اب وشعر میں اس کا انداز بالکل نیا، بہت تازہ اور دلکش ہے اس نے دو ناول لکھے جو پسند کیے گئے، افسانہ نگاری میں اس نے چونکا دینے والے موضوعات اپنائے، لیکن اس کی غزل میں سوچ اور گہرائی کا عنصر بدرجہ اتم ملتا ہے۔

موضوعات اور خیالات کی تازگی، ماحول کا تنقیدی جائزہ، رومانوی جذبات کا ریشمی اور نازک پہلو اس کی غزل کے عناصر ہیں، قاسم حسرت، عالم بیتاب اور یونس قیاسی نے پشتو کے ساتھ اردو نظم و نثر میں اپنے اندر چھپے ہوئے طوفانوں کا اظہار کیا، قاسم حسرت نے تو اپنی شاعری کا "بولتے پتھر" اور عالم بیتاب نے "منزل دل" اور "گوہر نایاب" کے نام سے مجموعے شائع کروا ڈالے۔ اس نسل کا سب سے کم عمر شاعر غلام محمد قاصر ہے۔ تسلسل کی اشاعت کے بعد وہ پاکستان گیر سطح پر پہچانا گیا ہے وہ بھی غزل کا شاعر ہے ابتداء میں اس کی غزل نے اہل ذوق کو چونکایا ہے۔

بعض دوسرے شعراء جنہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اپنے اپنے دور میں اپنی نسل کے نمایاں شاعر رہے ان میں کوہاٹ میں عزیز اختر وارثی، اخگر سرحدی، آذر سرحدی، شوکت محمود، جمیل راز بنگش، انجم یوسفزئی، اسلم فیضی، عطوف شفیق، سورج نرائن اور انور پراچہ، پشاور میں شمیم بھیروی، کیفی سرحدی، عبدالودود قمر، مبارک حسین حاجز، ایوب مائل سرحدی، فارغ قادری، چمن شاہ حیدری، ساحر آفاقی، حیرت جعفری، شاہد کیانی، عشرت ملک، روشن نگینوی، حفیظ اثر، حسین بخش کوثر، بنوں میں سلیم سرحدی اور راشد علوی، ایبٹ آباد میں مبارک اکمل گیلانی، سنگی میرٹھی، آصف ثاقب، صوفی رشید، نوشہرہ میں کلیم جلیسری، نامی سرحدی، میر زیدی، ڈیرہ اسماعیل خان میں محسن عمرانی، سعید احمد اختر، فاروق آزاد، غفار بابر، نیر سرحدی قابل ذکر نام ہیں۔

جدید ترین نسل سے کچھ پیشتر سرحد کے شعراء میں بعض خواتین بھی ابھریں' ایسی خواتین میں مہر نگار' سیدہ حنا' درشہوار شبنم' شمشاد رعنا' منور روف اور فیروزہ بخاری بہت اہم ہیں۔ موجودہ نسل میں بھی کچھ خواتین نے شاعری کی طرف توجہ دی ہے لیکن ان میں سے بعض جونہی بعض اداروں سے الگ ہوئیں ادبی موت مر گئیں۔

کچھ شعراء نے اپنی جوانی کے حسین دن سرحد میں گذارے اور سرحد کی ادبیات پر اثر انداز ہوئے اور یوں سرحد سے بھی کچھ اثر لیا۔ وہ سرحد میں آئے اور چلے گئے لیکن سرحد کی تاریخ ادبیات میں اپنا ذکر و نام چھوڑ گئے۔ ایسے شعراء میں ن م راشد' احمد ندیم قاسمی' عبدالحمید عدم' حمید نسیم' الطاف گوہر' حامد عزیز مدنی' باقی صدیقی' صادق نسیم' نصیر احمد زار' رشید قیصرانی' مظفر علی سید قابل ذکر ہیں۔ جدید تر اور جدید ترین نسل سے ذرا پہلے عابد علی سید' اسلم فیضی اور پیرا کرم پر مشتمل ایک مختصر سا قافلہ افق پر مودار ہوا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ پرانی اور جدید تر نسل کو یہ خوف لاحق ہوا کہ سرحد میں ادبی ذوق ختم ہوتا جا رہا ہے اور نوجوانوں کو پرانی نسل سے شکایت تھی کہ وہ ان کی ترقی کا راستہ روکے کھڑی ہے' اس میں شبہ نہیں کہ یہ مختصر سا زمانہ خزاں کے جھونکے کیطرح فضا کو زرد انے میں کامیاب ضرور ہوا لیکن جہاروں کا قافلہ رواں دواں تھا۔ بالکل نوخیز اور باذوق کھیپ کالجوں اور یونیورسٹی میں نئے دور کی نئی تحریکوں کا ساتھ دے رہی تھی طالب علمانہ سرگرمیوں میں شاعرانہ ذوق گھل مل کر ہنگامہ آراء ہوا' نذیر تبسم' مشتاق شباب' عزیز اعجاز' ناصر علی سید' اشرف عدیل' ڈاکٹر قاضی فصیح یکجا ہوئے اور انہوں نے ادبوانوں کی ایک ادبی انجمن کی بنیاد رکھی اس فورم نے ادبی محاذ پر بڑا مثبت کردار ادا کیا' نوخیز طلباء اپنے نوجوان ہراول دستے کے ساتھ بلا جھجک آگے بڑھنے لگے' بڑے بڑے شاعروں کی گھنی چھاؤں میں پھلنے پھولنے سے قدرتی محرومی کے امکانات ختم ہو گئے اور پھر اس قافلے میں ہزارہ سے ڈیرہ اسماعیل خان تک نوجوان اپنے اپنے نئے خیالات کے پرچم لیکر آگے بڑھنے لگے۔

جدید ترین نسل بہت سے ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کا مستقبل نہایت تابناک ہے اور جو سرحد میں ادب کی مشعل کو بلند اور روشن رکھے گی۔ بعض روایت پسندوں نے نئی نسل کو "غضب ناک جوانی" (ANGRY YOUNG MAN) کہہ کر ان کی اہمیت کو جوانی کی چنگاری دکھا کر جلانے کی کوشش کی' لیکن عشق اور مشک کی طرح ان نوجوانوں کی صلاحیتوں' تازگی کے شعور' نئے زمانے کی وسعتوں کا احساس اور روایت شکنی کے حوصلوں نے انہیں نمایاں کر دیا اور ان کی جرات پسندی اور قوت اظہار نے انہیں راستے کی تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔

یہاں اس سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرحد میں پسماندہ پریس اور ذرائع ابلاغ کی کمی کی وجہ سے بہت سے جوہر قابل گمنامی کی گرد میں پنہاں ہیں' بعض دور دراز علاقوں کے نابغہ اونچے اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتی ہوئی اپنی آواز سنے ہی لطف اندوز ہو کر رہ گئے اور اونچے پہاڑوں سے آگے سماعتیں ان کے نغمات کی لذت سے محروم رہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے دائرے میں بسنے والے بعض نوجوان اہل قلم ان اداروں کے صاحب اختیار انسانوں کی انسانی کمزوریوں کا شکار ہوتے رہے اور یوں پسند اور ناپسند کی چکی میں پستے رہے۔ بعض پرانے اہل قلم برگد بن کر ان نونہالوں کی نشوونما پر بھی اثر انداز ہوئے' یہ تھیں بعض وجوہات جن کی بناء پر اس سے پہلی نسل زیادہ تر اور موجودہ نئی نسل کسی حد تک گمنامی کا شکار رہی۔

صوبہ سرحد میں پشاور کو اچھے برے ذرائع ابلاغ کی موجودگی کی وجہ سے پہچانے جانے کے مواقع کسی حد تک حاصل ہیں۔ لیکن اب اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں نے دوسرے علاقوں کے نوجوانوں سے بھی شناسائی کے مواقع پیدا کر دیے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پیشتر کہا جا چکا ہے جدید ترین نسل کے شعور کو صیقل کرنے میں تعلیم کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہزارہ سے ڈیرہ اسماعیل خان تک کی جدید تعلیم یافتہ نسل نے مطالعے اور علمیت سے بہرہ ور ہونے کا ثبوت دیا اور نئی اظہاریت کے پرچم کھولے۔

پشاور کے شعراء میں ہراول دستے کے نوجوانوں میں نذیر تبسم' اشرف عدیل' عزیز اعجاز' مشتاق شباب اور ناصر علی سید ہیں ان میں عزیز اعجاز نے اپنا مجموعہ کلام "اجاڑ رتیں" کے نام سے شائع

بھی کرادیا یہ دوسری بات ہے کہ یہ مجموعہ وقت سے بیشتر شائع ہو گیا لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ عزیز اعجاز اس طرح بھیڑ میں اپنا راستہ بناتا ہوا نوجوانوں کی اگلی صف میں آ کھڑا ہوا۔
عزیز اعجاز کی پسندیدہ صنف غزل ہے اس نے جو نظمیں لکھیں ان میں بھی تغزل کی چاشنی بھرپور طور پر محسوس ہوتی ہے۔

یہ کس کی یاد نے آواز دی سر راہے　　مرے تو شام و سحر میں کوئی شریک نہ تھا

غزل میں عزیز اعجاز کی خصوصیت اور انفرادیت دراصل اسی شعر کا پھیلتا ہوا رنگ ہے۔ ایک کرب شکست جسے اس کی جوانی کے حوصلے شکست کہتے ہوئے جھجکتے ہیں۔

ہائے شکست عجز تمنا' شام پرستش بیت گئی　　ہائے مری ناکام عقیدت پیشانی تک خم نہ ہوئی
کون ہمارا کرب سمیٹے کس کو اتنی فرصت ہے　　ہم سے بیاں اعجاز کبھی جب شرح حدیث غم نہ ہوئی

جوانی کے تجربے بہت گہرے نقوش ثبت کرتے ہیں لیکن جوانی کا سب سے بڑا تلخ تجربہ جدائی ہے۔ عزیز اعجاز نے جدائی کے تجربے کو خصوصی طور پر محسوس کیا ہے اس کی زندگی نے اس جدائی سے گہرا تاثر لیا ہے۔

سکوت دشت میں آواز بازگشت نہ تھی　　وہ نصف شب کے مسافر کہاں ٹھکانے لگے
کسی نے لوٹ لیا قربتوں کا سرمایہ　　ہمارے ہاتھ تیرے درد کے خزانے لگے

یہ حوصلہ مندی کی بات ہے کہ درد اعجاز کے نزدیک کی حیثیت رکھتا ہے' دراصل شاعری میں وہی شخص کامیابی کی منزلیں طے کر سکتا ہے جو درد کو دولتِ حیات سمجھے' اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے عزیز اعجاز کو آگے بڑھنے اور نئی نسل میں اپنا مقام حاصل کرنے کا حوصلہ بخشا۔
نذیر تبسم اس قافلے کے مسافروں کا نمایاں ترین ہمسفر ہے۔ نذیر تبسم جواں ہونے کے باوجود جذبات کے ساتھ فکر کی گہرائی اور سوچ کے پھیلاؤ کو نظر انداز نہیں کر سکتا اس کا مشاہدہ عمیق ہے اور مطالعہ وسیع' اسے اردو شاعری کے حسن کا عرفان ہے اور اس حسن کو وہ اپنی شاعری کا طرہ امتیاز بھی بنانا چاہتا ہے۔

انا کو بیچ کر یوں سو گئے ہیں　　کہ جیسے پتھر ہو گئے ہیں
تبسم اب تو میرے خال و خد بھی　　غبار زندگی میں کھو گئے ہیں

پانی پر دائروں کا سفر ختم ہو گیا
جس موڑ پر ملے تھے وہاں سے بچھڑ گئے

نوجوان نسل کو بڑوں سے جو گلہ ہے' نذیر تبسم نے اس کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا ہے'

ہمیں اپنے بڑوں سے یہ گلہ ہے　　وہ اتنی نفرتیں کیوں بو گئے ہیں

نذیر کے ہاں نئی نسل کی انسانیت پرستی اور زندگی سے محبت کا جذبہ نمایاں ہوا ہے پرانی نسل کی انسانیت دشمنی کے احساس کے ساتھ ہی اپنے ماحول سے یہ گرد ہٹاتے ہوئے نئی نسل پر ذمہ داریوں کا بوجھ گہرا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

مجھے بچوں سے خوف آنے لگا ہے　　وہ بچپن ہی میں بوڑھے ہو گئے ہیں

ڈیرہ اسماعیل خان سے ایک ڈیرے میں ڈکی کی کھجور کی طرح ایک لمبا تڑنگا اور بانکا نوجوان اباسین آرٹس کونسل کے ایک مشاعرے میں آیا اور ایک رسیلے نینوں کی طرح رسیلی غزل سنا کر مشاعرے پر چھا گیا اس کا یہ شعر ہر شخص کی زبان پر تھا۔

سارے سپیرے ویرانوں میں گھوم رہے ہیں بین لئے　　آبادی میں رہنے والے سانپ بڑے زہریلے تھے
تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مے خانے کا پتہ　　ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

بعد میں غلام محمد قاصر لاہور چلے گئے وہاں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور احمد ندیم قاسمی کے ماہنامے فنون کی مجلسیں بھی دیکھیں اور یوں وہ فنی لحاظ سے ایک پختہ شاعر کی حیثیت سے پشاور لوٹا یہاں گورنمنٹ کالج میں لیکچراری اسے کہاں کہاں لئے پھری وہ خاموش مجرم کی طرح یہ سارے ظلم سہتا رہا اور پشاور کے نوجوان شعراء کے دلوں کی دھڑکن بن گیا لیکن موت نے اس سے مزید پھلنے پھولنے کا موقع چھین لیا۔
اشرف عدیل ایک باشعور نوجوان ہیں لیکن فلسفے کے مضمون سے پیشہ ورانہ طور پر منسلک ہونے کی بجائے وہ خیالات کے لحاظ سے بھی فلسفے کی مجسم تصویر نظر آتے ہیں اور اس کا اعتراف خود کرتے

ہیں۔

دیکھوں تو میں پہاڑ کی مانند پر سکوں   سوچوں تو ایک زلزلہ سارے بدن میں ہے

ڈینس آئزک پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہے لیکن فنون لطیفہ سے اس کی محبت اور لگن اسے ادبی حلقوں میں مقبول بناتے ہوئے ہے۔ فنون لطیفہ سے محبت کرنیوالا شخص نرم و نازک دل کا مالک ہوتا ہے لیکن جب ایسا شخص طب سے بھی منسلک ہو تو پھر اس کا دل انسانیت کے درد کا محرم بھی ہو جاتا ہے آئزک کی شاعری میں درد قافیہ بن کر بھی ردیف کی علامت بن گیا ہے۔

ہو گئے مایوس کچھ ہم درد سے ایسے کہ اب   درد بھی تیرا ہمیں ہمدرد سا لگنے لگا

کچھ مسلسل راحتوں نے چھین لی تھی روشنی   ساتھ جب سے غم چلے، رستہ سجھائی دے گیا

ڈینس کی طرح اعجاز حسن خان بھی اسی قافلے کا ایک مسافر ہے، انسانیت کی خدمت اس کا بھی مقصد حیات ہے، لیکن اس کے ہاں درد کی لذت کی جگہ سفر کی روانی کا لطف نمایاں ہے، پروفیسر پریشان خٹک اور پردل خٹک کے گھرانے کا یہ نوجوان بھی اپنے بزرگوں کے نقوش قدم پر چل رہا ہے۔

دل میں کچھ خوں ہے ابھی، آنکھ میں نم باقی ہے   کچھ ستم اور ابھی تاب ستم باقی ہے

راہ میں ہار کے ہمت نہ مسافر بیٹھیں   منزل شوق ابھی چند قدم باقی ہے

ارشاد احمر تازگی کا شاعر ہے، وہ روایت کے نام سے بھی یوں چونکتا ہے جیسے آہٹوں سے آہو۔ اس کی مسلسل غزلیں اس کے اپنے خیالات کے تسلسل اور ہم آہنگی کا پتہ دیتی ہیں اس منافقت بھری دنیا میں سچ کا علم بلند رکھتا بھی اصول اور حوصلے کی شان ہے، اس نے غزل میں روزمرہ کی سامنے والی باتوں کی سمویا ہے اور ان سے بات پیدا کی ہے۔

چوک میں دیکھوں تین رنگوں کی روشنیاں مسکاتی ہیں   ان تینوں میں زرد نشانی چکر والی سیڑھی ہے

وہ بچوں والی ہے اور تم آگے بڑھتے جاتے ہو   جلتی آگ اور بجھتا پانی چکر والی سیڑھی ہے

ابرار حسین انگریزی کا طالب علم فارسی زبان کو ذوق گھٹی میں لیکر اپنی مادری اردو کے بل بوتے پر نئی نسل کا ہم سفر بنا، اسے اپنے وطن کے ادیبوں سے یہ گلہ ہے کہ وہ زلف و رخسار کی مدح میں الفاظ کی

حرمت کو داغدار بنا رہے ہیں۔

یہ اور بات آنکھوں کے آگے پڑا رہا   سچائیوں کا لاشہ بے جاں تمام رات

لیکن مرے وطن ترے شاعر ترے ادیب   تھے وقف مدح زلف پریشاں تمام رات

ارشد تقویم الحق ایک ایسے علمی گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جس نے پشتو زبان و ادب کو نئی چاشنیاں اور نئی آب و تاب بخشی، ان کے والد سید تقویم الحق کاکا خیل نے پشتو زبان کو ہلکے پھلکے ادب اور طنز و مزاح کی لذتوں سے مالا مال کر دیا۔ ارشد نے بھی ڈینس اور اعجاز کی طرح میڈیکل سائنس کے شعبے کو اپنایا لیکن اس کمال یہ ہے کہ خالص پشتو زبان کے ماحول میں رہ کر کوثر و تسنیم سے دھلی بے داغ اردو میں شعری لطافتوں کی تخلیق کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

ردائے سبز میں خوابیدہ بند کلیوں کو   پیام چاک گریباں کہاں سے آتے ہیں

ارشد نے جدیدیت کو اپنایا ہے لیکن روایت سے رشتہ نہیں توڑا، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ قدامت پسند ہے۔ دراصل روایت سے مکمل طور سے رشتہ توڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ بغیر بنیاد کے عمارت کھڑی کر دی گئی ہو۔

حرم کی راہ میں اک دو بتوں کو رہنے دو   یہ پاشکستہ جبینوں کے کام آتے ہیں

ایوب خاور اپنے بھرپور جذبوں، مشاہدوں، تجربوں اور اپنے ایک نقطہ نظر کا شاعر ہے خاور ان باشعور نوجوانوں میں سے ہے جو حال میں مستقبل کا عرفان رکھتے ہیں اور مستقبل میں ماضی کے حسن کے گلاب کھلاتے ہیں۔

اس کی آنکھوں کھلنے والے سارے موسم مجھ میں تھے   اب وہی موسم ہیں یاد رفتگاں اور ایک میں

پاتال کے اندر بھی ہے ایک پاتال   یہ راز تو وا پانی میں اتر کے ہوئے

خاور احمد سرحد کے جدید تر دور کے خوبصورت غزل گو سعید احمد اختر کا بیٹا ہے، لیکن بیٹے کی پہچان اس کا والد نہیں وہ خود ہے۔ والد کے دور، خیالات اور فن سے الگ جدیدیت کے حسن اور ماحول کی خوشبوؤں میں بجی ہوئی بالکل نئی اور بالکل اچھوتی غزل کہنے والا خاور۔۔

اپنی حالت دیکھ کے پوچھوں' کھڑکی دیر سے کیوں کھولی تھی
اس کی مجبوری سوچوں تو اپنے سوال پہ دکھ ہوتا ہے

پھول پہ آ کے بیٹھی تو خود پر اترانا بھول گئی
ایسی مست ہوئی وہ تتلی پَر پھیلانا بھول گئی

ساجن کی یادیں بھی خاورؔ کیسے وقت پہ آ جاتی ہیں
گوری آٹا گوندھ رہی تھی' نمک ملانا بھول گئی

خاورؔ احمد کی شاعری کی تازگی میں پھولوں کے رنگوں کی رعنائی' تتلیوں کی اڑانوں کا وقار' خوشبوؤں کے رواں دواں قافلوں کی پھیلتی دھول اور ان سب سے بڑھ کر جوانی کے جذبوں کی دھوپ چھاؤں کا تقدس ملتا ہے۔

جو بھی رنگ دیکھوں سوچتا ہوں میں
تجھ پہ یہ رنگ جانے کیسے لگے

خاورؔ احمد والد کی راہ پر رواں ہے' زندگی کرنے اور زندگی کا رس نچوڑنے اور ریشمی خیالات کی سیج سجانے کے معاملے میں دونوں ایک سا مقدر لیکر آئے ہیں لیکن بیٹا تازہ دم نظر آتا ہے۔ دراصل جوانی اور طاقت کا احساس ہر نئی نسل کو اڑانے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

شجاعت علی راہیؔ۔۔ کوہاٹ کا سب سے سلجھا ہوا' سب سے زیادہ پڑھا لکھا اور سب سے زیادہ جدید شاعر ہے' اس نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ "برف کی رگیں" شائع کر کے بعض دوستوں کے نزدیک عجلت سے کام لیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ عجلت نہیں' اپنی شناخت کا ایک عملی اظہار ہے' ابھی راہیؔ کے سامنے زندگی کی بڑی طویل شاہراہ پڑی ہے قدم قدم پر تجربات کی ٹھوکریں ہیں' وہ ان ٹھوکروں میں نئی راہیں تراشنے میں کامیابی حاصل کر کے رہے گا' وہ راہیں جو ہر پھر کر اپنی جانب لوٹ آتی ہیں۔

میں نے کہا کہ زہر سے بھی تیز تھی کوئی چیز
ساقی نے زندگی کا پیالہ دیا مجھے

پہلے تو اک حسیں سے موج آئی میرے گھر
پھر اس کے بعد سارا سمندر ہی آ گیا

کیسے حسین شہر تھے' کیا لوگ تھے مگر
دنیا میں خوب گھوم کے میں گھر ہی آ گیا

حیات نظامی۔۔۔ مشرقی پاکستان میں بھی مہاجر رہا اور اب پاکستان آ کر بھی نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو مہاجر سمجھتا ہے۔ یہی سوچ اس کی شاعری سے اس کی روزمرہ زندگی کی تلخیوں کا سبب بنی ہوئی ہے' غالب کا یہ شعر اس کی زندگی کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اس کے احباب اس کی نفسیاتی بیماری کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہے ہیں اللہ کرے اسے مکمل شفا نصیب ہو۔ لیکن اس کے اس جذبے نے اس کی شاعری کو ایک تجربے کے مختلف رنگ ضرور بخشے ہیں۔

گرا لو کندہ خود اپنے ہی کتبے
زمانہ کسی کو مانتا ہے

حیات آنکھوں پہ اپنی ہاتھ رکھ لو
یہ دل منظر پرانے مانگتا ہے

میرے دستِ شوق کے وہ سلسلے
سرد کتنے دوستوں کے ہاتھ تھے

یہ پشاور تو پھر پشاور ہے
اس سے کچھ کم نہ میرا ڈھاکا تھا

شاہ نواز سواتی ہزارہ کے ایک گریجویٹ۔۔۔ کلاسیکیت کی طرف رجحان کے باوجود عملی طور پر رومانیت پسند ہے' فلسفہ حیات' غم عشق' تصوف اور وطن کی لگن کا دعویٰ کرنے کے باوصف زندگی میں اس کا رویہ وہی ہے جو انسان کا فطری رویہ ہے اس نوجوان کے ہاں دوستی' دشمنی' رقابت کے جذبات اس کی شاعری میں بھی بار پاتے ہیں اور یوں اس کی شاعری انسانی رویوں کی شاعری بن جاتی ہے۔

جنہیں پڑوس میں دیکھا تھا رات بھر اٹھتے
وہ شعلے صبح ہمارے مکان تک پہنچے

ہماری آگ خوشی سے دیکھنے والے
خدا کرے یہ تمہارے مکان تک پہنچے

کسے تم ہی کہو دیوانہ پتھر موڑ کر مارے
کہ پتھر مارنے والا پس دیوار ہوتا ہے

مشتاق شباب صحافت' ڈرامہ نگاری' افسانہ نگاری اور تراجم سے ہو کر شاعری کی راہ پر آئے' ریڈیو کا محکمہ بھی ایک عجیب تربیت گاہ ہے' کئی ناتراشیدہ پتھر یہاں اصنام بنے' مشتاق شباب نے بھی اس چار دیواری میں بہت کچھ سیکھا' پتھروں کو تراش کر خدا بن جانے کا تجربہ اس نے یہیں سے حاصل کیا۔

تراشتا ہوں جسے وہ خدا ہی بنتا ہے — خیال ہے کہ نئے بت تراش کر دیکھوں
وہ میرے پاس تھا تو مجھے پوجتا رہا — مجھ سے جدا ہوا تو خدا ہو گیا وہ شخص

شباب کا فن۔۔ ایک شہر میں رہ کر تالاب کی طرح محدود تھا' اب وہ شہر سے نکلا ہے تو اس کا فن بھی دریا کی روانی کی طرح قوتوں کی علامت بن رہا ہے۔ اگرچہ وہ اس بات کا سبب کچھ اور بتاتا ہے۔

میں تیری یاد میں آزاد نظم لکھتا رہا — ترے خیال کو چھو کر بحور میں آیا

شوق جعفری اس گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جہاں سید ضیاء جعفری جیسا مرد شعر و شباب پیدا ہوا اور جس کی منزل تصوف بنی' شوق میں بھی شعر کی لگن ویسی ہی ہے' شوق بھی نئی نسل کے ان نوجوانوں میں سے ہے جو اظہار ذات کیلئے اپنی ابتدائی شاعری کو بھی کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کر ہی دیتے ہیں۔

اگرچہ شوق کا مجموعہ کلام بھی بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح وقت سے پہلے منصۂ شہود پر آیا۔ لیکن اس طرح اسے اپنی غزل گوئی کی ندی کو رواں دواں رکھنے کیلئے تخلیق کی راہوں پر گامزن رہنا پڑے گا۔۔ شوق اپنے نام کی مناسبت سے شاعری سے دلی لگن رکھتا ہے اس کے پاس کہنے کو بھی بہت کچھ ہے۔

ان کہی' ان کہی نہ رہ جائے — ایک تازہ غزل کہوں میں بھی
نو دمیدہ سا' سرکشیدہ سا — اس جزیرے میں ایک ہوں میں بھی

دریا ہوئی نہ آنکھیں تو یہ اور بات ہے
پھرتے رہے ہیں دل میں سمندر لئے ہوئے

ابوسفیان صفی ہزارہ کا بہت نوخیز لیکن صلاحیتوں سے لدا پھندا شاعر ہے اس کا دل سمندر کی طرح جذبات کی طغیانیوں سے آشنا ہے' امنگیں اس کے خیالات میں ابھر رہی ہیں وہ بھی اپنے گردوپیش سے موضوعات چنتا ہے' حیرت اس کی شاعری کا عنوان ہے۔

میں گھر کے روزنوں سے یہی جھانکتا رہا — جاگے ہیں کتنے لوگ ابھی تک اذان سے
میں بھی تیرے خلوص کی آواز ہوں صفی — نسبت مری بھی ہے تری کچے مکان سے

صفی ایک معصوم نوجوان ہے' سچا' منافقوں اور جھوٹ سے دور' اسی لئے اس کی شاعری میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جنہیں سن کر منافق بزرگوں کی جبینیں شکن آلود ہو جاتی ہیں۔

جو تیرے میرے بدن کا رشتہ ندامتوں سے لہولہو ہے
تو تیرے میرے لہو کے اندر یہ اٹھ رہا ہے ابال کیسا
تو مجھ کو سورج بھی مانتی ہے تو یہ بتا دے کہ تیرگی میں
چمک رہا تھا تری جبیں پر ندامتوں کا ہلال کیسا

طاہر مسعود۔۔۔ بھی زندگی کے تلخ و ترش تجربات تک رسائل حاصل کر چکا ہے۔ اس کی اپنی ذات بھی روشنیوں اور سایوں میں بٹ کر رہ گئی ہے' یوں اس کے تجربات بھی اس کی ذات کی پرچھائیوں سے عبارت ہیں۔

باہر کے دلفریب مناظر کے ساتھ ساتھ — دل میں کسی کی یاد کی پرچھائیاں بھی دیکھ
دیکھی تھی میرے شوق کی تو نے بلندیاں — اب میرے دل کے زخم کی گہرائیاں بھی دیکھ
غضب تو یہ ہے کہ میرا جو ہم سفر ٹھہرا — سفر پہ جب میں نکلا وہ اپنے گھر ٹھہرا

بلائیں آئیں بہت سی' پری نہیں آئی
میں ایک پاؤں پہ پانی میں رات بھر ٹھہرا

ظہیر قریشی نرم و نازک احساسات کا آدمی ہے' انسانی جذبات کی ترجمانی کا مقدس فریضہ خلوص سے ادا کرتا ہے' اس کا موضوع حسن اور متعلقات حسن رہا ہے۔ وہ الفاظ کی مصوری کرتا ہے' اس کی منظر

نگاری شعر کو رنگِ حُسن اور فطرت کا ادراک بخشتی ہے۔

منزلوں کا عکس دکھلاتے رہے شام وسحر — سُورجوں کا زہر نیلے پانیوں میں رہ گیا

پُھول آنکھ میں یُوں نہیں کِھلتے — کچھ تعلق تو بارشوں سے ہے

تجھ کو دیکھا ہے فاصلوں سے مگر — تجھ کو سوچا تو دھڑکنوں سے ہے

صباحت عاصم واسطی۔۔ شوکت واسطی کے واسطے سے کہ اس کا والد ہے۔ ادب کی دنیا میں وارد ہوا' گھر پر ماحول شاعرانہ ملا' ادبی محفلوں میں گھٹنوں کے بل چلنے والے نوجوانوں کو دوڑ کا حوصلہ پاتے دیکھ کر اس نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی شروع کر دی اور پشاور کے نوجوان شعراء کے ساتھ مل کر اس نے اپنی منفرد آواز کا جادو جگایا' عاصم بھی اسی ہم سفر دوستوں کا ساتھی ہے جو میڈیکل کالج کے ڈائی سیکشن ہال میں مُردہ انسانی اعضاء پر جراحی کا عمل کرتے ہوئے زندہ جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اس کے ایسے تجربات کا روپ دھار کر نئے اور انوکھے رنگ میں نکھرتے ہیں۔

وہ کٹ چکی تو کسی بھوک میں نہیں چمکی — کھڑی ہوئی تھی تو یہ فصل کیا سنہری تھی

وہ تھک چکے تو زمینوں پر سو گئے عاصم — جنہوں نے سر پہ رکھی شاہ کی مسہری تھی

لگا نہ اس پہ مگر پھر بھی داغ عریانی — بدن سے جس کے کئی پیرہن اُتارے تھے

توقیر فراغ موجودہ نسل کا سب سے کم عمر شاعر ہے' لیکن جذبات و مشاہدات کے لحاظ سے اس کی عمر پختہ معلوم ہوتی ہے کہ شاید اسے اس عمر میں تلخ تجربات کے سمندر سے گذرنا پڑا ہے۔

نئی چوڑی سے کلائی بھی سجا بیٹھے گی — سُرخ جوڑے میں ہر اک بات بھلا بیٹھے گی

جس ہتھیلی پر مرا نام لکھا تھا اس نے — اس ہتھیلی پہ وہ مہندی بھی رچا بیٹھے گی

میں اس کے جسم کی عُریانیوں کو ڈھانپتا ہو — وہ اک لباس کی صُورت اُتارتی ہے مجھے

جاوید مُراد۔۔۔ جوانی کی اس منزل میں ہے جہاں توہمات دامن تھام تھام لیتے ہیں۔ خیالات کہانیاں بنتے ہیں اور دل خوف کے سایوں میں لرزتا رہتا ہے۔

گھر کے آنگن میں ہر صُبح پھول بھی بکھرے ملتے ہیں

رات کو کچھ آسیبی سائے پتھر بھی برساتے ہیں

شہر کی سڑکوں پر اک تنہا رُوح بھٹکتی پھرتی ہے

لوگ اسے انسان سمجھ کر ملنے سے کتراتے ہیں

حُسن اور محبت کی فضا اس کے ہاں تغزل کا روپ دھار لیتی ہے۔

جہاں جہاں تری خوشبو مجھے پکارے گی — وہاں وہاں دلِ وحشی تجھے صدا دے گا

مُصطفیٰ کمال بھی میڈیکل کالج کا طالب علم ہے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ادب کی شاہراہ پر گامزن ہے' اس کی شاعری میں بھی زرد رنگ اپنی معنویت کے ساتھ نوحہ کناں نظر ہے۔ بعض نوجوانوں کو معصومیت رنج والم کی منزلوں کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے' شاید جوانی میں دُکھ غم اور فراق کے صدمے زیادہ حسین معلوم ہوتے ہیں' الم پسندی کی یہ رومانیت مُصطفیٰ کمال کے ہاں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

شام کی پرچھائیاں کچھ زرد پتے اور ہوا — میں مری تنہائیاں کچھ زرد پتے اور ہوا

لمحے ہی سب سرمایہ ہیں' بھر لو یہ کشکول کمال — پھر تو یہ دل خالی ہوگا' وہ لڑکی تو کل جائیگی

ڈھولکی کی تھاپ میں سسکی دبی رہ جائیگی — بھیگی پلکوں سے مجھے وہ دیکھتی رہ جائیگی

مقبول عامر بنوں جیسے دُور افتادہ علاقے میں ادب کے چراغ روشن کئے ہوئے ہے۔ عزیز اعجاز اعجاز اور ظہیر قریشی کی طرح عامر بھی بینکنگ سے متعلق ہے' حسابات میں اُلجھ کر خوبصورت مضامین کو موضوعِ شعر بنانا ان نوجوانوں کا معمول بن گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عامر زندگی کے تلخ حقائق سے گریز کر کے خواب بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو زندگی کی حقیقتوں کو کھلی آنکھوں سے جذب کر کے انہیں قرطاس پر پھیلاتا ہے۔

کیوں خوابوں کے محل بنائیں' کیوں سپنے تعمیر کریں

جو کچھ ہم پہ بیت رہی ہے' کیوں نہ وہ تحریر کریں

وہ رنگوں کو ہندسوں کی طرح از بر کرنے کا بھی قائل ہے

جس کے سارے رنگ مری آنکھوں کو از بر ہیں عامر
آؤ دِل کی دیواروں پہ وہ صُورت تصویر کریں

ناصر علی سید ایک محنتی اور باہمت جوان ہے' صحافت سے ادب اور ادب سے تعلیم کی منزل پر پہنچا' انجمن آرائی اس کی خصوصیت ہے۔ انگریزی ادب کے ذوق کے حوالے سے اردو میں بھی انگریزیت کی چاشنی پیدا کرنے کو جائز سمجھتا ہے' افسانہ' تنقید' کالم نگاری اور شاعری محبوب موضوعات ہیں' مطالعے سے فوری اثر قبول کرتا ہے۔ مثلاً میر کا اثر یوں لیا ہے۔

کس طرح جلتا ہے یادوں کے الاؤ میں بدن
تو بھی تک دیکھ ادھر آ کے کبھو رات گئے

اپنے دَور کی خامیوں پر نگاہ رکھتا ہے' اور شعر میں اِن حقائق کو لا کر حقیقت نگاری کی سرحدوں میں داخل ہوتا ہے۔

سب ہی بیساکھیاں نفرت کی لئے پھرتے ہیں
کتنا مفلوج ہے اس دَور کا انسان' ناصر

طارق احمد نواز نے پشاور یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی سند حاصل کی' اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنے احباب میں نمایاں رہا' لیکن فارغ التحصیل ہو کر وہ ایسا انسپکٹر آف مائنز بنا ہے گویا کان نمک کا ہو کر رہ گیا ہے' اب انجمنوں میں اس کیلئے آنکھیں ترستی ہیں' نواز ایک باشعور نوجوان ہے' اس نے اپنے گرد و پیش کے حُسن و قبح کو موضوع شعر بنایا ہے اور اس طرح اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح زندگی کی ترجمانی کا مقدس فریضہ ادا کرتا ہے۔ لیکن حسن اور رنگ اس کی زندگی کو روشنی کی طرح منور رکھتے ہیں۔

میری بانہوں پہ تری لمس سے پھول اُگنے لگیں
دشتِ جاں کو کبھی گلزار بھی ہو لینے دو

جشنِ مہتاب

۲۳ مئی ۱۹۴۹ء کی ایک یادگار محفل

جشنِ مہتاب

ترتیب

اہتمام: انجمنِ ترقی اردو (سرحد) پشاور

تاریخ انعقاد ------------ ۲۳ مئی ۱۹۴۸ء

مقام ------------ شاہ ولی قتال (قصہ خوانی)

وقت ------------ ۱۰ بجے رات

صدارت ------------ سید ضیا جعفری

پہلی کرن (خطبہء صدارت) ------ سید ضیا جعفری

چاند (نظم علامہ اقبالؒ) ------- مجید شاہد

سیلِ نور ------------ آرکسٹرا

غالب چاندنی رات میں ------- خواجہ شمیم بھیروی

رحمان بابا شبِ ماہ میں ------- نثار احمد شباب

چاند کا گیت ------------ خاطر غزنوی

چاندنی (تاثرات)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید مظہر گیلانی

پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے۔۔۔۔۔ خورشید بیگم

چاند کا رومان (افسانہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نذیر میرزا برلاس

کرنیں (منتخب اشعار)۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عبدالودود قمر

مہ پارے (گیتوں بھری کہانی)۔۔۔۔۔ سید فارغ بخاری

عکسِ ماہتاب (ادبِ لطیف)۔۔۔۔۔ رضا ہمدانی

بزمِ مہتاب (مشاعرہ)۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سید مظہر گیلانی

عشرت ملک

مجید شاہد، احمد فراز

بدر اعجمی، محسن احسان

فرید عرش، شوکت واسطی

اعجاز شمس، اختر جعفری

(چاند کی چودھویں رات ہے۔ احاطہ شاہ ولی قتال کے وسیع میدان میں سفید چاندنیاں بچھی ہوئی ہیں۔ اور ان پر سفید گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔ چاندنیوں پر ہر طرف چنبیلی کے پھول بکھرے ہوئے اپنی روپہلی خوشبو سے اجلی فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ ہر طرف شہر کے معززین، ممتاز افسر، صحافی' ملک کے مشہور شعرا ' ادبا اور مقامی ادبی انجمنوں کے نمائندے تشریف فرما ہیں۔ ان مہمانوں میں جناب ن۔م۔راشد، الطاف گوہر اور حمید نسیم قابلِ ذکر ہیں)

چاند قرنوں سے جگمگا رہا ہے یہ اسی طرح جوان ہے جس طرح پہلے دن تھا یہ جوان ہے کیونکہ مسکراتا ہے ہنستا ہے اور قہقہے لگاتا ہے۔ اور بقول حضرت جوش

مہترانی ہو کہ رانی مسکرائے گی ضرور کچھ بھی ہو جائے جوانی مسکرائے گی ضرور

جب اس دھرتی اس آگ کے ٹکڑے نے سورج کو الوداع کہا اور آگ برساتی اور دھواں اگلتی ہوئی فضائے بسیط میں گھومتی رہ گئی۔ تب بھی چاند یونہی ہنس رہا تھا یونہی قہقہے لگا رہا تھا اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی، نرم نرم دوشیزہ کرنوں نے اس ابلتے اور چیختے ہوئے شرارے کو ٹھنڈک پہنچائی تھی اور پھر یہ شرارہ دھرتی بن گیا۔ لیکن اس کے دل میں غم و غصہ کا لاوا ابلتا رہا اور اس غم و غصہ نے دھرتی کو جلد ہی بوڑھا کر دیا اس کے چہرے پر بڑے بڑے گڑھے اور جھریاں پڑ گئیں۔ لیکن یہ چاند ہنستا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا کیونکہ وہ جوان رہنا چاہتا تھا۔

آج ہم یہاں چاند کے قہقہوں میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں۔ دیکھیے حسین ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں اور ان ستاروں کے جھرمٹ میں چاند جگمگا رہا ہے اور قہقہے لگا رہا ہے۔ ہماری "اِس" سانس لیتے ستاروں کی محفل کے لئے بھی ایک چاند کی ضرورت

ہے۔ تاکہ اس کی ضیاباریوں سے محفل میں کچھ اور چکا چوند پیدا ہو جائے۔

سید ضیا جعفری مسند صدارت پر تشریف لاتے ہیں

مسند صدارت ایک براق سوزنی ہے، اس پر ایک سفید گاؤ تکیہ لگا ہے، سوزنی پر سفید کھلے ہوئے پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ سید فارغ بخاری صاحب تشریف لاتے ہیں اور صدر مجلس کے گلے میں موتیا کے پھولوں سے گندھا ہوا ہار پہناتے ہیں

لیجئے ہم چاند کے قہقہوں میں شریک ہو ہی گئے، اب صاحب صدر خطبہ ءصدارت پڑھیں گے۔ یہ پہلی کرن ہے۔

پہلی کرن (خطبۂ صدارت)

سرحد کی سرزمین قدیم سے معرکہ خیز اور انقلاب انگیز رہی ہے۔ لیکن یہ تازہ انقلاب جس سے آپ کو آزاد مملکت حاصل ہوئی ہے۔ قومی انقلاب ہے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ قوم نے اپنے عزم واستقلال کے بل پر غیروں کے پنجے سے خلاصی حاصل کر کے نئی زندگی اور آزادی حاصل کی۔ اب تک ہماری زندگی اپنی نہیں تھی۔ محض نقالی تھی، دوسروں کے رحم وکرم پر تھی۔

اپنے ہونے اکا اطلاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ہماری اپنی تہذیب اور روایات میں رنگی ہوئی نہ ہو۔ ہمیں اس تہذیب اور روایات سے اس لئے بھی محبت ہے کہ اس میں قومیت کی بو باس ہے، ہمیں اس کی قدر اس لئے بھی ہے کہ اس میں ترقی کی بڑی گنجائش اور زندگی کی تکمیل کے لئے بہت بڑی وسعت ہے۔ اگر ہماری زندگی اس رنگ سے محروم ہے تو وہ مستعار مصنوعی، بے رنگ اور بے معنی ہے۔ قومیت کیلئے یکرنگی کی، یکرنگی کے لیے ہم خیالی کی، ہم خیالی کے لیے ہم لسانی ہونے کی ضرورت ہے۔ بقول بابائے اردو۔

''جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں جہاں خیال ایک نہیں، وہاں دل بھی ایک نہیں۔'' وحدت لسانی دلوں کو جوڑتی اور بیگانوں کو یگانہ بنا دیتی ہے اردو نے بدرجہ کامل یہی خدمت انجام دی اور یہ اس کی بڑی کرامات ہے۔ ہمارے اس مقدس وطن میں جس کو ہم آج پاکستان کے نام سے یاد کر رہے ہیں۔ اردو زبان کو عملی اور نظری طور پر عوامی اور ملکی زبان تسلیم کر

لیا گیا ہے۔ اردو زبان ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی تہذیب کا عظیم ترین ورثہ ہے۔ جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ملا ہے۔ حضرات میں اس بات کو نیک فال سمجھتا ہوں کہ سرحد کی سنگلاخ زمین میں آج انجمن ترقی اردو کے ہاتھوں اردو کا پرچم لہرا رہا ہے اور اسی طرح اور بھی متعدد انجمنیں اردو کی نشرواشاعت میں سرگرم عمل ہیں سرحد میں غالب اکثریت فاتحین کی اولاد کی ہے ہم ہی نے فارسی کے ساتھ ہندوی کا پیوند لگا کر اردو زبان بنائی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے اردو زبان بنانے والے کارواں در کارواں گذرے۔ ترقی کی یہ رو جو اس وقت ہم انجمن ترقی اردو پشاور میں دیکھ رہے ہیں۔ ''جشن ماہتاب'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ انجمن کا دوسرا پروگرام ہے اور صوبے میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے اور اس کی اولیت کا سہرا انجمن کے سر ہے کیوں نہ ہو اس عبوری دور میں جہاں زندگی کی قدریں بدل چکی ہیں۔ نئی اقدار اور نئے تجربے بروئے کار آ رہے ہیں نئی صبحیں، نئے افق سے نمودار ہو چکی ہیں۔ خوابناک وادیاں گونج اٹھی ہیں، سوئے مرغزار جاگ اٹھے ہیں۔ وہاں انجمن کے ارباب بست وکشاد نے بھی اپنا خوشگوار فرض ادا کیا۔ بے ادب کے خزاں رسیدہ چمن کو ایک نئی بہار سے روشناس کیا ہے۔ جس کی کلیاں سماج کے دلوں میں پھوٹ رہی تھیں۔ اور یہ ہے، چاندنی شعر اور نغمے کا خوشگوار امتزاج، ہماری اس تمام جدوجہد کا مقصد دماغی تعیش اور ذہنی تلذذ نہیں۔ بلکہ اس کے پس منظر میں اردو زبان اور اردو کلچر کی نشوونما، ارتقا، قومی ضمیر کی بیداری اور اردو زبان کو مقبول عام بنانے کا پاکیزہ جذبہ ہے۔

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے　　چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنودے

شعرائے کرام جانتے ہیں کہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے یہ ایک دوسرے سے اتنے قریب اور ایسے ملے جلے ہیں کہ ایک معلوم ہوتے ہیں۔ شعر ترنم ہی کی صوتی ترجمانی ہے دنیا کے تمام راگ راگنیاں درحقیقت شعر کے اوزان ہیں۔ شعر نغمہ کی تخلیق کرتا ہے شعر کی مقبولیت اور اثر انگیزی کا راز ترنم اور موسیقیت میں پنہاں ہے۔ جس شعر میں جس قدر زیادہ موسیقیت پائی جائے گی اسی قدر زیاہ اثر انگیز ہوگا۔ ترنم شعر کی جان ہے۔ نظیری فرماتے ہیں۔

بانگ نے می برد ز ہوش مرا　　می دہدے ز راہ گوش مرا

حضرات! شعر ونغمہ کے ساتھ ساتھ مناظر پرستی بھی از ان کی طبیعت ثانیہ ہے لیکن حسن کائنات کو بے حجاب دیکھنا اس کے بس کی بات نہیں اس کے لیے چند مخصوص لوگ ہیں۔ جن کی نگاہیں ظاہری پردوں سے گذر کر اشیاء کی حقیقت تک پہنچ جاتی ہیں۔ فطرت ان حقائق کو نورانی الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ لیکن شاعر کے سوا اسے کوئی نہیں سنتا۔ یہی نقوش موسیقی بن کر اس کے نغموں سے بہہ نکلتے ہیں۔ اس کا نام شعر ہے۔ گویا شعر نغمہ حسن و جمال ہے۔ چاند سے ہر ایک کو محبت ہے انسان کیا، پرندے بھی آپ کو کرنوں کے دام میں اسیر نظر آئیں گے۔ چاند جب کرنوں کی انگڑائیوں میں جاگتا ہے اور زندگی کے مرکز پر روشنی رقص کرتی ہے۔ آسمان کھل جاتا ہے اور ہنسی تمام زمین پر پھیل جاتی ہے۔ تتلیاں اپنے پروں کو نور کے سمندر میں پھیلا دیتی ہے۔ کنول اور چنبیلی کے پھول روشنی کی لہروں پر لہرانے لگتے ہیں شاعر کی کل کائنات روشنی کا کھیل بن جاتی ہے۔ چاندنی میں محبت، مسرت اور حسن بن کر اس کے لبوں پر رقص کرتی ہے۔ آج کی محفل بھی اس رقصِ جمیل کا ایک رنگین عکس ہے۔

پہلی کرن نے ماحول میں زندگی بھر دی، اب لیجئے مجید شاہد علامہ اقبال کی نظم چ د ترنم سے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

آپ نے حکیم الامت کی نظم چاند ملاحظہ فرمائی اب مطربوں کی انگلیوں کی جنبشوں اور نازک تاروں کی نرم نرم سانسیں اور طبلے کے دل کی دھڑکنوں اور تانوں کا زیر و بم اور نغموں کا سیلِ نور ملاحظہ کیجئے، سازوں پر وہ نغمہ جسے سن کر چاند بھی جھومنے لگتا ہے۔۔۔ چاندنی کیدارا

یہ راگ سمپورن یعنی سات سروں کا مجموعہ ہے۔ اس کا وادی سر یعنی سب سے زیادہ روشن سر مدھم ہے۔ اس کی روشنی سے راگ کی صحیح شکل پیدا ہوتی ہے، یہ راگ فارس کا ہے اور اس راگ کی شبیہ اساتذہ فن نے یوں بنائی ہے۔۔۔ عمر ۴۰ سال، شکل نورانی۔۔ ایک حسین باغ میں آگ کے الاؤ پر بیٹھا ہے اور عبادت کر رہا ہے۔ لباس سیندوری اور ریش سفید

یہ راگ وزن کے لحاظ سے تین تال میں ہے

چاندنی کیدارا چار سازوں پر۔ لیجئے ان چار سازوں کا تعارف بھی پیش ہے۔

ستار

یہ ساز حضرت امیر خسرو نے محمد تغلق کے زمانے میں ایجاد کیا۔ اس کا اصلی نام سہ تار یعنی تین تاروں والا ساز ہے۔ اس میں وچتر وینا کے برعکس ایک تونبہ ہوتا ہے۔ اور تانت سے بندھے ہوئے پیتل کے تیرہ پردے ہوتے ہیں، کھرج سے کھرج تک دو قائم سر یعنی کھرج اور پنچم، باقی پردوں کو اوپر نیچے کھسکا کر کومل اور تیور بنا دیا جاتا ہے یعنی بارہ سر اور تیرھواں دائرہ مکمل کے والا پھر کھرج۔۔ ستار نواز ہیں استاد عبدالغنی خاں پٹیالے والے۔۔۔

وائلن

یہ مغربی ساز ہے لیکن اب ہماری موسیقی کا جزو بن گیا ہے۔ سترھویں صدی میں اٹلی کے شہر کریمونا میں سٹریڈ پرطاؤس نے ایجاد کیا لیکن اب تک اٹلی میں اس کا نام سٹریڈ Streed ہے، اس میں چار تار ہوتے ہیں پہلا تار کھرج سے مدھم تک اور دوسرا تار پنچم کھرج تک اور یونہی تیسرا اور چوتھا تار بڑھوتی کے سات سر لئے ہوتا ہے۔ یہ ساز گز یعنی Bow سے بجایا جاتا ہے۔ فنکار ہیں استاد عبدالغنی خاں کے چھوٹے بھائی جعفر حسین خاں

سیکسا فون

یہ ساز بھی یورپ سے آیا ہے۔ یہ بانسری کی ترقی یافتہ جدید صورت ہے، عام طور پر بینڈ میں استعمال ہوتا ہے، اس میں بانسری کے سوراخوں کے بجائے چابیاں لگی ہوتی ہیں، آواز میں روشنی اور گونج ہوتی ہے۔ ساز کار ہیں برکت علی خاں

طبلہ

بعض لوگوں کے خیال کے مطابق پہلے پہل طبلہ سدھاڑی خاں دھاڑی نے ایجاد کیا بعض لوگ کہتے ہیں کہ پکھاوج کے دو ٹکڑے کر کے امیر خسرو نے طبلے کی یہ شکل ایجاد

کی۔ پکھاوج ہندوؤں کا ڈھولک کی طرح لمبا ساز ہوتا تھا اور گلے میں ڈال کر بجایا جاتا تھا۔ بہر حال یہ موسیقی کا نہایت اہم جزو ہے۔ تال یا وزن کا کام دیتا ہے طبلے کی حیثیت موسیقی میں بالکل اسی طرح ہی جس طرح شاعری میں بحر اور وزن۔ فن کار ہیں محمد طفیل خاں۔۔۔ تو لیجئے ملاحظہ ہو آرکسٹرے پر چاندنی کیدارا

(نغمہ کار سازوں پر سیل نور پیش کرتے ہیں)

چاند نغموں سے مسحور ہوگیا ہے اور اس نے اپنی کرنوں سے ماحول کو دودھیا بنا دیا ہے۔ ایسے میں عبدالودود قمر مہمانوں کی تواضع دودھیا شربت سے کرتے ہیں۔ رات روشن اور شیریں ہوگئی ہے، ایسے میں خواجہ شمیم بھیروی میرزا غالب کو اس رنگین محفل میں کھینچ لائے ہیں، لیجئے سنئے ان کا یہ فیچر:

مرزا غالب چاندنی رات میں

احاطہ کالے خان کے آنگن میں ایک مونڈھے پر سوگوار شہر آرزو مرزا غالب دہلوی سر بہ زانو بیٹھے ہیں۔ حقہ سامنے دھرا ہے کبھی کبھی سر اٹھا کر کش لگا لیتے ہیں۔ قریب ہی حکیم مرزا عیش کھڑے ہیں۔ جب دھوئیں کے نقرئی بادل چاند کی کرنوں سے الجھ الجھ کر منتشر ہوتے ہیں تو حکیم کہتے ہیں۔

حقہ پیتا ہے، شعر کہتا ہے
اور عاشق میں کیا برائی ہے

غالب منہ سے نے الگ کر رہے ہیں، گنگناتے ہیں۔

دم نکلتا ہے، آہ مچلتی ہے
شب ماہتاب کی دہائی ہے

اتنے میں حکیم احسن اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے

''میرزا نوشہ! مجرا عرض ہے۔''

غالب: کیا بھلے وقت میں آگئے حکیم صاحب! میں اور حکیم عیش اس کھلے آسمان کے نیچے چاندنی میں شعر کی تفسیر ڈھونڈ رہے ہیں۔

فلک سے ہم کو کیا کیا عیش رفتہ کا تقاضا ہے
متاع رفتہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

حکیم احسن اللہ: لیکن پیر و مرشد! کیوں نہ لال قلعہ کے درمیان میں جشن ماہتاب منایا جائے۔ اس چار دیواری میں رونقِ بیابان کہاں؟

عمریست کہ قانونِ طرب رفتہ زِ یادم
آموختہ را باز سبق میکنم امشب

میرزا غالب: کیا کہوں حکیم صاحب، ابھی مسیں نہ بھیگی تھیں۔ اکبر آباد میں بچپن گزر رہا تھا۔ تاج محل کے مرمریں سایوں میں جمنا گھاٹ پر کیا کیا جشنِ ماہتاب نہ منائے ہوں گے۔ لو وہ میرزا تفتہ بھی آگئے

''استاد آداب بجا لاتا ہوں''

غالب: جیتے رہو، وہ متاع عزیز بھی لائے۔

میرزا: پیر و مرشد! خانہ زاد زاویہ ادراک کو نہیں چھو سکا۔

غالب: بلا کے آدمی ہو بھئی۔ وہ جو تم آج میرا حاصل دعا مسجد میں لائے تھے اور میری نماز سنت سے فرض نہ ہوسکی۔

تفتہ: حضور استاد۔ غلام بارگاہ وہ کیف و مستی کا شعلہ بیکراں بستہ دہلیز معبد پر رکھ چکا تھا کہ امام عالی مقام کی گرمی آواز نے زہرہ آب آب کر دیا۔ اور خانہ زاد عین عجلت میں حضور کے دست مبارک میں وہ شے لطیف دے کر دو زانو ہو گیا۔

غالب: ہائے ہائے کیا غضب کرتے ہو۔

کہتے ہیں قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور۔

میری جان، وہ تو میں وہیں مسجد کے غسلخانہ میں چھوڑ آیا۔ ذرا لپک کے جاؤ ہم لال قلعہ کے میدان میں پہنچتے ہیں۔ تم وہیں آ جانا۔

لو وہ تیرؔ، حالیؔ، جان میکناب مجروح اور مفتی صدالدین آزاد بھی آ گئے۔ چاندنی کی روپہلی روشنی میں یہ قافلہ قلعہ کے درمیان بڑھ رہا ہے۔ حالی پاس ادب سے حقہ تھامے ہیں۔ میر مجروح تمباکو کی کامدانی جھولی گلے میں لٹکائے استاد کے بائیں کاندھے پر ہاتھ رکھے جا رہے ہیں بلیماروں سے آگے بڑھے تو کوچہ نیچہ بنداں کے پھاٹک پر رکے، داغ منتظر کھڑے ہیں۔ جھکے اور اتنے جھکے کے میرزا کو کہنا پڑا۔

یہ نیائش کہ چھپے تو مجھے منظور نہیں

کیونکہ تمہاری رونمائی بھی کم از سیلیءِ دیجور نہیں

داغ بھلا چوٹ کھا کر دبنگ تھوڑے ہی ہیں۔ سن لیجئے، فرماتے ہیں۔

تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

اگر ہو چاندنی شب تو مہ کامل میں رہتے ہیں

قافلہ خراماں خراماں چلا جا رہا ہے۔ تیرؔ خاموشی کو توڑتے ہیں۔

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب

اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مفتی آزرہ بغل سے اگالدان نکال کر بڑھاتے ہیں۔ استاد آہ بھر کر کہتے ہیں

گرمی اندیشہ نے پایا فروغ

جوہر بلغم سراپا جل گیا

داغ: حضور استاد، خانہ زاد کی گستاخی تصور نہ کریں تو عرض کروں۔

غالب: شوق سے کہو۔ جان غالب

یہ شب ماہ، یہ نظارے یہ لمحات جمیل

تم جو آ جاؤ تو افلاس بھی مرجھا جائے

غالبؔ: صدیوں تک جیو کیا ترقی پسندانہ شعر ہے ٹھیک ایک صدی بعد کا مگر ظالم!

غزل تم نے چھیڑی مجھے ساز دینا

مری نوجوانی کو آواز دینا

داغؔ نے غالبؔ کو پھر شباب رفتہ کی موہوم وادیوں میں جا پھینکا۔ استاد نے قدم پلٹے اور پھر کوچہ نیچہ بنداں کو مڑ گئے۔ غنا خانہ محبوب قریب ہے آواز دی ہی تھی کہ مہدی مجروح نے کہا۔

عشق کی راہ میں ماہِ ابر آلود کی چال

ان کا درباں نہ کہیں وزدِ حنا کہہ بیٹھے

غالب مسکرا کر کہتے ہیں۔

کیا چور ہیں کہ غالب درباں کسی کا ٹوکے

کہہ دینگے ہم تو ان کے رشتہ کے ماموں جاں ہیں

محبوب کی آواز آتی ہے۔

تم آؤ گھر میں ہمارے یہ کبریائی ہے

میں کیوں کہوں کہ شب ماہ میں برائی ہے

غالبؔ بڑھتے ہیں احباب حقہ، اگالدان اور تمباکو کی جھولی لئے ہمرکاب ہیں۔ چھت پر سفید و زرد

ریشم سے بنے ہوئے ایرانی قالین اور گاؤ تکیے رکھے ہیں چاند اپنی پوری آب و تاب سے نور افشاں ہے۔ اہل بزم کے چہروں پر ایک سیل غازہ ہے۔ کہ بہے جارہا ہے۔ چاند کی کرنوں میں سموئے ہوئے نرم و نازک ہوا کے جھونکے تقاضائے مستی کو بے لگام کئے دیتے ہیں مرزا نہ رہ سکے۔ محبوب سے کہتے ہیں۔

تو ماہ شب چاردہم ہے مرے گھر کا
گر جام نہیں ہے تو پلا اوک میں بھر کے

مفتی آزردہ کچھ برافروختگی میں فرماتے ہیں۔

آسکے تم نہ راہ پر غالب
کوئی دن نہ مے پئے ہوتے

استاد مسکرا کر کہتے ہیں۔

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں بھر کے نا ند شب مہتاب میں

اور مفتی صاحب یہ چاندنی یہ مجروح و حالی کے مہتابی چہرے اور یہ کنار محبوب

آج شب وہ ماہ عالم تاب کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا میکدے کا در کھلا

غالب نے ابھی در کھلا ہی کہا تھا کہ میرزا تفتہ لرزاں و خیزاں داخل ہوتے ہیں

غالب......اوہو تم بہت پریشان ہوگئے۔

تفتہ......قبلہ و کعبہ، مسجد سے واپسی پر ہی حضور کے ہاں میمنت لزوم ہونے کا علم ہوگیا تھا۔

غالب: مگر یہ چہرے پر ہوائیاں، پریدگی رنگ، خیریت تو ہے۔

تفتہ......حضور کیا عرض کروں مسجد میں قدم رکھا تو مؤذن نے ٹوکا۔ وہ میرے اشکہائے بے دامن کو

ع جامۂ احرام کے دھبے سمجھ کر تن گیا

میں بعجلت غسل خانہ میں داخل ہوا آہ! نصیب اعداد بوتلیں خالی سرنگوں پڑی تھیں۔ بعد از بسیار تحقیق احوال یہ مبرہن ہوا کہ بہ سہو ابہام امام عالی مقام نے وضو کر ڈالا۔

یہ کہہ کر تفتہ میرزا کے قدموں میں سر ڈال دیتے ہیں۔ آہیں ہیں کہ چاند پر حملے۔ آنسو ہیں کہ گویا ع

پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

غالب بڑے پیار سے تفتہ کا سر اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں میری جان گو یہ...... واقعہ سخت اور جان عزیز...... کا معاملہ ہے لیکن تاسف یہ ہے۔

نہ ٹوکا کسی باخدا نے نہ ٹوکا
مرے خوں سے جب وہ وضو کر رہے تھے

محبوبہ طناز نے جام بلوریں میں بادۂ حسن بھر کر پیش کیا اور کہا۔

بلا سے پی گیا زاہد شراب کیا کم ہے
غلام ساقی کوثر ہو تم کو کیا غم ہے

غالب...... جان غالب

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
پینے کو پی ہی لیتے ہیں مے جس قدر ملے

محبوب...... مگر آپ میری جانب اس قدر کیوں بڑھنے لگے

غالب......

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

مفتی صدرالدین نے اجازت چاہی۔ غالبؔ مسکرا کر کہتے ہیں۔

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو — موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

جب وہ آیا جانبِ مغرب نظر — اک نگارِ سیم رو رخ سر کھلا

یوں گیا بھر بجم آزردہ کہ جوں — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

مفتی آزردہ ایک قہقہہ کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔

چاند اپنی نرم رو موجوں میں بہے جا رہا ہے۔ میر مہدیؔ حالی کو چھیڑ رہے ہیں۔

تیرے پر تو سے ہیں فروغ پذیر

قصہ خوانی و مسجد و حمام

اور جان میکناب گرہ لگاتے ہیں۔

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز

اپنی صورت کا اک بلوریں جام

اور یہ کہکر اٹھتے ہیں ''شب بخیر استاد!''

''شب بخیر جانِ غالب!''

رات اپنی پہنائیوں کو لیے قریب منزل ہے تیرؔ اور مجروحؔ پر نیند غالب آرہی ہے۔ غالبؔ کی آغوش میں فرقِ محبوب ہے۔ تفتہ کی بھی آنکھ نہیں لگی۔ وہ تڑپ کر کہتا ہے۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی

جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

صبح کا آخری گجر بجتا ہے غالب کی آنکھ کھل جاتی ہے نہ وہ محفل نہ محبوب، وہی کالے خان کا احاطہ یا علی کر کے آہ بھرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

وہ بھی تھی اک سیم پاکی سی نمود

صبح کو رازِ مہِ انور کھلا

میرزا غالب کو آپ نے چاندنی رات میں دیکھ لیا، نثار احمد شباب حسینی ''عبدالرحمان بابا کو اس محفل میں ہاتھ اسے پکڑے چلے آتے ہیں، بظاہر کاغذ اور کاغذ میں رحمان بابا

نثار احمد شباب حسینی سناتے ہیں۔ رحمان بابا شبِ ماہ میں

رحمان بابا شبِ ماہ میں

پشتو زبان کے حافظ حضرت عبدالرحمٰن بابا صاحبؒ کی شرکت کو بھی جشن مہتاب کی اس تقریب میں ضروری سمجھتے ہوئے چاند کے متعلق ان کے الہامات کو آپ حضرات تک پہنچانے کی جسارت کرتا ہوں۔ اس انتخاب کی خاطر میں نے دوبارہ ان شبستانوں کو روشن کیا۔ ان آسمانوں کو پر سحاب۔ ان زمینوں کو سرسبز، اس آنگن کو وسیع تر، ان امنگوں کو رقصاں ان تاروں کو لرزیدہ، ان جلوؤں کو غلطاں، ان ماہ پاروں کو فروزاں کیا جو میرے ذہن کے افق پر سالہا سال سے دیوان عبدالرحمٰن کے مطالعہ کے بعد نقش ہو چکے تھے۔ اور اس طرح انجمن ترقی اردو کی اس رومان پرور تقریب میں پشتو ادب کی نمائندگی ادا کرنے کی کوشش کی گئی۔

حضرت عبدالرحمٰن باباؒ ایک ولی کامل اور مردِ حق آگاہ تھے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کے محبوب کا آئینہ خانہ تھا۔ بقول غالبؔ

از ذرہ تابہ مہر دل و دل ہے آئینہ

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

عبدالرحمٰن باباؒ وحدت کے نشہ میں چور مہر شیون اور مظاہر قدرت میں عکس محبوب کو دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

پورتہ بدر راشکارہ شو سبکتہ نمر

سبکتہ پورتہ وارہ مخ دے د دلبر

اس کے گوشوں پر مہتاب جلوہ گر ہوا زمیں پر آفتاب رونما ہوا سبحان اللہ اب تو بلند و پست پر محبوب

ہی کا حسین چہرہ بے نقاب دکھائی دے رہا ہے۔

اور جب کبھی ایک ساعت کے لئے بھی محبوب کا دیدار میسر نہیں آتا تو کہہ اٹھتے ہیں۔

شپه لا پریږه ورځ ا ورځ رابانده شپه شوه

د رحمان ماه تمامه راشه راشه

رات تو رات ہے میرا روزِ روشن بھی رات سے بدتر ہو گیا۔ اے رحمان کے ماہ تمام! آ اور جلد آ!
کبھی کبھی مستی کے عالم میں جب وصالِ محبوب میسر آتا ہے۔ تو بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔

سپوږمئے مے را پالنگ د پاسه رنړي

چه م یار په بالست اولګوی سر

وہ میرے پلنگ پر غلطاں ہوتا ہے۔ جس وقت میرا محبوب بالش ناز پر سر رکھتا ہے۔

اس پر چاند کا غلطاں ہونا عبدالرحمن بابا کے فن کا بے بدل مرقع ہے۔ اس طرح محبوب کے رخصت ہونے کے بعد جب اس کو نہیں مانتے تو یوں فرماتے ہیں۔

که ګریوان م د سپوږمئے د نمر مشرق شي

زه چه بار په سنر ګو نه وینم تور تم دے

اگر چاند میرے گریباں سے بھی طلوع ہو تب بھی محبوب کے بغیر میری نظروں میں دنیا اندھیر ہے

کبھی فرطِ محبت میں محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

سپوږمئے هم را هسے تاڼو خوری ستا لا مخه لا

چه په هره میاشت کس دوه دوه نیمه کیګی

چاند تیرے حسن کی تاب نہ لا کر رشک سے ہر مہینے دو مرتبہ دو نیم ہوتا ہے۔

چاند کے متعلق ایک نادر تخلیل ملاحظہ فرمائیں۔ پشتو ادب میں اس بہترین شعر شاذ و نادر دیکھنے میں آئے گا۔

خوبرویان به د سپوږمئے ټکړه رواخلی

که رحمان کچکول په لاس ګډیں قلندر شي

اگر رحمان کچکول محبت ہاتھ میں لیکر قلندروں کی طرح آئے تو جہاں بھر کے محبوب قرص ماہ لے کر حاضر ہو جائیں۔

یہ منظر نگاری کا ایک بہترین نمونہ ملاحظہ ہو۔

دا هلال دے چه لیدے شي په شفق کښ

که په لاس د ګل اندام مے سپین وسی دے

یہ شفق کے پس منظر میں ہلال نظر آ رہا ہے۔ یا گل اندام مجسمہ کے ہاتھ میں سفید کنگن؟

شاعری شخصیت کا عکس ہوتی ہے۔ شاعر کے شعر میں اس کی شخصیت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔ محبوب جتنا بلند، ارفع اور کمالات حسن کا مجسمہ ہوگا۔ اتنے ہی بلند ارفع، اور پاکیزہ جذبات اس کی طرف منسوب کئے جائیں گے۔ رحمان باباؒ کا محبوب رنگ و بو کی دنیا کا بسنے والا مجازی محبوب نہیں ان اشعار میں محبوب اور محب دونوں کی شخصیتوں کا عکس ملاحظہ فرمائیں

چه توسن د فلک زین کا لا نازه

دا هلال ئے په ځائے راشي د رکاب

په درګاه د دریوزه کاندے د حسن

کنډولے په لاس سپوږمئے هم آفتاب

جب محبوب توسنِ فلک پر سوار ہوتا ہے۔ تو ماہ نو کا حلقہ رکاب بن جاتا ہے۔ اس کی بارگاہ ناز میں آفتاب اور ماہتاب کچکول گدائی لے کر حسن کی بھیک مانگتے ہیں۔

☆

آج غالب اور رحمان بابا ہمارے پاس نہیں، ہم اس دور سے گزر آئے ہیں لیکن چاند

اسی طرح جوان ہے، راتیں اسی طرح روشن اور حسین ہیں انسان کے ذہن میں وہ گیت اسی طرح گونج رہا ہے وہ گیت جو چاند کا گیت ہے جو آپ کا گیت ہے جو میرا گیت ہے

چاند کا گیت ۔خاطر غزنوی

اس چہرے کی اک اک جھری
دھیان کی لہر کا روپ لیے
کتنی پیچھے جا پہنچی ہے

رات کی زلفوں میں بکھرے ہیں
ننھے ننھے شوخ ستارے
اور ان تاروں کے جھرمٹ میں
اک شہزادہ روپ سنوارے
مسکاتا ہے، لہراتا ہے، اپنی کرنیں برساتا ہے
چنچل بالک مچل مچل کر
ہمک ہمک کر
اپنی بانہیں پھیلاتا ہے
"میّا لے دو چاند کھلونا"

اس چہرے کی اک اک جھری
دھیان کی لہر کا روپ لیے
کتنی پیچھے جا پہنچی ہے

رات کے مسکاتے آنچل میں

شوخ ستارے سوچ رہے ہیں
سانول کی امیدوں کے پر
آج حوادث نوچ رہے ہیں
چاند یونہی مسکا مسکا کر اپنی کرنیں برساتا ہے
بیکل سانول غم میں ڈھل کر
بھٹک بھٹک کر
اپنی باہیں پھیلاتا ہے
لیکن قسمت میں ہے رونا
اس چہرے کی اک اک جھری
دھیان کی لہر کا روپ لئے
کتنی پیچھے جا پہنچی ہے

رات نے گیسو بکھرائے ہیں
سارا منظر ہانپ رہا ہے
یہ جوڑا کچھ سوچ رہا ہے
دھڑکن دھڑکن دل بیکل ہے
چاند ارادے بھانپ رہا ہے
لیکن پھر مسکاتا ہے اپنی کرنیں برساتا ہے

بجیل گبھرو سنبھل سنبھل کر

جھجک جھجک کر

اپنی بانہیں پھیلاتا ہے

''بانوان باہوں پر سونا،،

اس چہرے کی ہر جھری

دھیان کی لہر کا روپ لیے

کتنی پیچھے جا پہنچی تھی، کتنی آگے جانکلے گی

چاند مگر یونہی۔ مکا کر اپنی کرنیں برساتا تھا

چاند یونہی مسکا مسکا کر اپنی کرنیں برساتا ہے

اور یونہی مسکا مسکا کر اپنی کرنیں پھیلائے گا

کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا

اور اس چہرے کی ہر جھری

دھیان کی لہر کا روپ لیے

ان کرنوں میں کھو جائے گا۔

☆

انسان بوڑھی دھرتی کا بیٹا ہے، وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کے چہرے پر جھریاں اپنا تسلط جما لیتی ہیں، لیکن اسے چاند کا حسین چہرہ کبھی نہیں بھولتا۔ اور وہ چاند کو قہقہے لگاتے دیکھ کر قہقہے لگانا چاہتا ہے۔ وہ بھی جوان ہونا چاہتا ہے لیکن اس کے قہقہوں کو دھرتی کے چہرے کی جھریاں پی لیتی ہیں۔ اور چاند یونہی ہنستا رہتا ہے۔ اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی نرم نرم اور کنواری کرنیں یونہی ٹھنڈک بکھیرتی رہتی ہیں جس ٹھنڈک نے ابلتے اور چیختے اور لاوا اگلتے اور آگ برساتے اور

گھومتے ہوئے شرارے کو منجمد اور یخ بستہ کر دیا تھا ---- یہ چاندنی ، یہ ٹھنڈی چاندنی ---ٹھہرئے اب سنئے حضرت مظہر گیلانی سے ایک تاثر ----اس تاثر کو مقالہ کہا گیا ہے لیکن مقالہ بھی تو تاثر ہوتا ہے۔ چاندنی --

چاندنی

چاندنی۔ شاعر کو مرغوب ہے اور اس کا ماحول شاعر کے لیے سروش کی آواز ہے

چاندنی۔ ناثر کو پسند ہے اور اس کے اثرات ناثر کی زندگی کا حسین سرمایہ

چاندنی۔ بادہ آشام کی تھکی ہوئی اور پژمردہ زندگی کے لیے حیات نو کی لہر۔

چاندنی۔ ناظر کی آوارہ ہوسناک نگاہوں کے لیے عیش کا بہانہ

چاندنی۔ محبت کرنے والوں کی وہ دنیا جسے وہ خوابوں میں دیکھتے ہیں

چاندنی۔ صوفی کی ارضی معراج اور سجدہ شکر کا ماحول

چاندنی۔ فلاسفر کے لیے وجہ دماغ کاوی

چاندنی۔ ملا کے لیے اڑچن اور مزدور کے لیے سامان مسرت!

حیات مستعار کی ہر منزل پر تڑپتے ہوئے دلوں کے ساتھ چاندنی رات کا تعلق ہے اور ہر شعبہ زندگی میں مصروف عمل آوارہ نگاہوں کو چاندنی سے لگاؤ ہے

شاعر خواب سے چونکا، پگھلے ہوئے سونے کا دھارا بہتے ہوئے دیکھ کر اچھل پڑا۔ کائنات پر نگاہ ڈالی سنہری پن کا سمندر ہلکورے سے لے رہا تھا۔ کائنات اور کائنات کی ہر چیز سونے کے پانی میں بھیگی ہوئی معلوم ہوئی۔ لمحہ بھر تو کے بعد محسوس ہوا کہ دماغ بھی روشن و منور ہے اپنی بیاض اور قلم کی طرف نگاہ کی۔ نرا سونا معلوم ہوا۔ شاعر مسکرایا اور زندگی کا نہ مٹنے والا سنہری نقش بیاض پر مرتسم کر دیا۔

ناظر نے نگاہ اٹھائی چاند اور ستاروں سے، ریت کے ذروں سے، اونچے پہاڑوں سے، گہرے
دریاؤں سے، سبز پتوں اور مترنم آبشاروں سے نور کے ابلتے ہوئے چشمے دیکھے۔ مختلف زندگیوں کو
مختلف اعمال میں مصروف و منہمک پایا۔ اپنے دماغ اور اپنے تخیل کو سنہرے بازوؤں کے
سہارے بسیط نور پر پراں دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قلم اور تخیل کو سنہری کاغذ پر رقص
کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بادہ آشام نے انگڑائی لے کر نظر اٹھائی۔ چاند اور صراحی میں تمیز نہ کر سکا۔ گھٹے ہوئے اعصاب
میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ساغر اٹھایا اور غٹ غٹ چڑھا گیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا بہت سے پھر بھی
صراحی اور چاند میں یکسانیت تھی۔ صراحی چاند کی طرح اور چاند صراحی کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن
اب صراحی میں نور تھا شراب نہیں بادہ آشام فطرت کا بخل برداشت نہ کر سکا تلملا اٹھا۔ چاندنی
نگاہوں پر بوجھل معلوم ہوئی۔ چاندنی میں کیفیت کی بجائے تڑپ اور کسک محسوس ہوئی پکار اٹھا

یہ سیل نور ستم ہے شراب نہ ہو سکا

ناشر نے چاندنی کا لطف اٹھانے کے لیے کائنات بھر میں تاج محل کا بلند منارہ تجویز
کیا۔ سیل نور نے تاج کے گوشے گوشے میں ڈھل جانا چاہا۔ مگر ناظر کی نگاہیں جمنا پر گڑی رہیں۔
کچھ دیر بودی اور بیہودہ نگاہوں کے اتار چڑھاؤ سے بسیط نور میں تاریک لکیریں ڈالتا رہا۔ اور
پھر تاج محل کی تعریف کرتے ہوئی زینوں سے اتر آیا۔

محبت کرنے والوں کی نگاہیں اٹھیں اور چاند کی شفاف بساط پر ایک دوسرے سے ہمکنار ہو کر رہ
گئیں

صوفی نے مراقبے سے سر اٹھایا۔ شدت نور کی تاب نہ لا کر سبحان اللہ کہتے ہوئے پھر سجدہ میں گر

فلاسفر نے کھڑکی میں سے ہاتھ باہر نکال کر چٹکی بھری اور کمرہ کے اندر اندھیرے میں کھول دی۔
اندھیرے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ فلاسفر نے سر ہلا کر کہا یہ کم از کم مادی تو نہیں مگر اس مسلسل ضیا باری کا
حیات انسانی پر کیا اثر ہے اور اگر چاندنی نہ ہو تو حیات انسانی پر کیا اثر پڑے گا۔

ملا کے نیند میں ڈوبے ہوئے بھاری بھرکم پپوٹوں میں شب ماہتاب کے اثرات سرایت کرنے
لگے۔ ملا ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحہ غور سے دیکھا اور پھر بڑبڑایا ۔ارے یہ تو
چاندنی ہے ابھی سحر کہاں! اور پھر سو گیا۔

☆☆☆

درخت کے سائے میں دن بھر کے تھکے ماندے مزدور کو ساغر اور جام کی پیہم کھنکار نے جگا دیا۔
مزدور نے لیٹے لیٹے نگاہ ڈالی۔ وسط چمن میں میز کے گرد چند سائے متحرک نظر آئے۔ مزدور نے
یاس انگیز نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر کروٹ بدل کر سو گیا۔

☆☆☆

انجمن ترقی اردو کے فکر پیشہ اراکین نے زندگی کی پیہم مصروفیتوں سے اکتا کر چاندنی رات کے
آغوش کا سہارا پایا اور دم بھر ستانے کے لیے چاندنی کا بہانہ تراشا، لوگ سمجھے خوش فکرے
ہیں۔----------

☆

انسان محبت کرتا ہے چاند کی نرم کرنوں اور دودھیا چاندنی سے۔۔ لیکن چاند کے
قہقہوں کی زد سے پرندے بھی نہیں بچ سکے ایک باورا پنچھی چاند کی پریت میں جان کھونے لگا
یہ چاند اور پنچھی کی محبت کا قصہ خورشید بیگم کی آواز میں سنئے

پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے ۔۔۔ نغمہ)

انسان اور پنچھی چاند سے محبت کرتے رہے لیکن چاند بھی محبت کرتا رہا۔ یہ حسین اور روشن

چاند۔ جو قہقہے لگاتا ہے جوان رہنے کے لئے محبت کرنے کے لئے چاند کے رومان کا افسانہ نذیر میرزا برلاس سے سنئے

چاند کا رومان

میں چاندنی رات کو اپنی پھلواری میں بیٹھی پھولوں کے ہار پروتی ہوں۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم نرم خوشگوار جھونکے میرے جوڑے کے ہاروں سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔۔۔

میرے ہونٹوں پر نغمے لرزتے ہیں اور میری نظریں شہزادے کے محل پر لگی رہتی ہیں۔ آپ کیا جانیں شہزادے کا محل کہاں ہے اس کی تعمیر میرے جواں خوابوں سے ہوئی ہے آپ کی نظریں اس کی دیواروں کو چھو نہ سکیں گی۔ اس محل کی دیواریں چاندی کی ہیں اس کے کلس اور مینار سونے کے۔۔

اس کے دریچوں میں قوس قزح کے پردے آویزاں ہیں ان کے حاشئے نیلگوں ہیں ابر کے ننھے ننھے رنگیں پارے ان کے گرد منڈلاتے ہیں۔ ان کی اوٹ میں تارے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔۔۔

ہر چودھویں رات کو شہزادہ سنہری لبادہ پہنے کرنوں کے جھرمٹ میں ان پردوں کو آہستہ سے سرکاتے ہوئے بڑی سج دھج سے اپنے محل سے باہر آتا ہے اور سنہری رتھ میں بیٹھ کر اپنے رات کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ ناچتی کرنیں اس کا تبسم ہیں۔۔۔۔۔۔۔وہ مسکراتا ہے تو ستاروں کی روشنی تیز ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔

جب شہزادے کا رتھ میری پھلواری کے برابر سے ہو کر گزرتا ہے تو دم بھر کو رتھ کھینچنے والے شعلے آپ سے آپ تھم جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

میری جوانی چاندنی کا روپ دھار لیتی ہے۔۔۔۔۔۔ میرے گیتوں کی سرمئی آواز میں گونج پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گونج آہستہ آہستہ شہزادے کے سنہری کرنوں والے لبادے میں کھو

جاتی ہے، شہزادہ مسکراتا ہے۔۔۔۔۔ اس کی مسکراہٹ میری الھڑ جوانی کے گرد ہالہ بنا لیتی ہے۔ میں اپنی آرزوؤں کے کھلونے اس کے قدموں میں ڈال دیتی ہوں۔ وہ انہیں پیار کی نظروں سے دیکھتا ہے۔۔ کھلونوں میں روشنی اور ٹھنڈک سی آجاتی ہے۔۔۔ فضاؤں میں سُروں کے ترانے سنائی دینے لگتے ہیں جیسے کرنیں پریاں بن گئی ہوں اور مل کر ہمارے رومان پر مسرت کے نغمے گا رہی ہوں۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہزادہ رتھ سے اتر کر میری پھلواری میں آیا چاہتا ہے، رتھ کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں، رتھ چل پڑتا ہے وہ سنہری لبادہ سنبھال کر پھر رتھ پر سوار ہو جاتا ہے۔

ہر چودھویں رات سنہری رتھ میری پھلواری کے برابر دم بھر کو رکتا ہے اور چل پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ایک ایسی رات بھی آئے گی کہ یہ رتھ یہیں رک جائے گا شعلے ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔۔۔۔۔ مسافر شہزادہ مسکراتا ہوا میری پھلواری میں اترے گا۔ میں اپنے آرزوؤں کے سنہری کھلونے اس کے قدموں میں ڈال دوں گی۔۔۔۔۔۔۔ وقت کا دھارا رک جائے گا اور میرا مسافر ۵ شہزادہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری پھلواری میں ٹھہر جائے گا۔۔۔ اور میں اپنی جوانی کے خوابوں سے اس محل تعمیر کروں گی۔۔۔ لیکن آپ کی نظریں اس محل کی دیواروں کو نہ چھو سکیں گی۔۔۔۔۔۔

☆

چاند اپنے دل کے زخموں کو قہقہوں سے چھپاتا ہے وہ ایک حد تک کامیاب ہے۔ وہ اپنے داغوں کو چھپا لیتا ہے یوں بھی لوگ اس کے داغوں پر نظر نہیں کرتے، اس کے قہقہوں کو سنتے ہیں لیکن شاعر۔۔۔ لوگ کہتے ہیں بہت حساس ہوتا ہے۔ چاند کے قہقہے سنتا ہے یا اس کے داغ گنتا ہے۔ عبدالودود قمر آپ کو چیدہ چیدہ شعرا کے وہ اشعار سنائیں گے جن میں شعرا نے چاند کے لئے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے،

(کرنیں عبدالودود قمر)

چاند سے ہر ایک کو محبت ہے۔ انسان کیا، پرندے بھی کرنوں کے دام میں اسیر نظر

آتے ہیں۔ چاند جب کرنوں کی انگڑائیوں میں جاگتا ہے۔ چکور اس کے قیامت خیز شباب پر
نثار ہونے کو لپکتا ہے۔ طاؤس رقص کرنے لگتا ہے۔ نادان اور بھولا بچہ اسے پکڑنے کے لیے
ہمکتا ہے۔ روتا ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے بازو پھیلاتا ہے لیکن جو اثر شاعر پر ہوتا ہے۔ لیجیے وہ
شاعر کی زبان سے سنئے

میرزا اسد اللہ خان غالبؔ: چاندنی رات میں خدا کی یاد واقعی زہرہ گداز ہے فرماتے ہیں

زہرہ گر ایسا ہی شام ہجر میں ہوتا ہے آب — پرتو مہتاب سیل خانماں ہو جائے گا

☆

غالب چھٹی شراب پہ اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روز ابر و شب مہتاب میں

حضرت مومن بھی اس محفل میں کسی سے پیچھے رہنے والے نہیں۔ چاندنی رات میں بے اختیار
شوقِ وصال جاگ اٹھتا ہے محبوبہ خانہ رقیب میں ہے آپ بھی وہیں جا دھمکتے ہیں۔

شوقِ وصال دیکھ کے آیا عدو کے گھر — سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر

☆

لکھنو پھر بھی لکھنو ہے وہاں کی عطر بیز فضا میں چاندنی بھی معطر نظر آتی ہے۔ محبوب کے گھر
آنگن پر تختہ گل کا گماں ہوتا ہے۔ شہیدی مرحوم جیسے باصفا بھی چاند کا بالش سرہانے رکھ کر چاندنی
کے بستر پر سوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کیا عجب بالش ہو اس کا چاند بستر چاندنی — گھر کے آنگن پر گماں تختہ شبو ہوا
کس کے عطر جیب سے شب ہے معطر چاندنی

اب لکھنو سے اکبر آباد چلئے دیکھیے۔ سیمابؔ صاحب ساغرؔ کے ہمراہ تاج کی سیر کرتے ہوئے نظر
آتے ہیں اور ساغر کو ایک درزیدہ نگاہ سے دیکھ کر چاند سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

رات بھر ظلمتوں پر عطر برساتا رہا — شوخیاں کرتا رہا، ہنستا رہا، گاتا رہا

بیٹھ کر تاروں کی محفل میں سحر تک بے نقاب — سطحِ عالم پر بہا کر اپنی کرنوں سے شراب
خواب سے لیتا ہوا انگڑائی اٹھا ہے کوئی — دیکھ کر آئینہ تیرا مسکرایا ہے کوئی

☆

اب ہم جمنا کے کنارے سے تاج محل سے بیک جنبش نظر راوی کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ آہ
پنجاب کا مردم خیز خطہ۔ گرامی کی سرزمین، اقبال کی خوابگاہ، دیکھئے ہندوستان کے مشہور شاعر
حضرت حفیظ راوی میں کشتی پر سوار کچھ گنگنا رہے ہیں۔ جبکہ چودھویں کا چاند آسمان پر اور سطحِ
آب پر بیک وقت جگمگا رہا ہے۔

کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے — جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلی ریز ہے
چاند بالائے فلک ہے چاند زیر آب ہے — چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بے تاب ہے
چاند کو گھیرے میں لے کر بہہ رہی ہے چاندنی — کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

☆☆

چاند کی خواب آور کہانی سننے کے لیے جناب یوسف ظفر سیر کہسار میں مصروف ہے۔

حسن کی لطافتوں میں غرق منظر سحر — موج نور سے ہو جیسے ماہتاب تر بتر

☆

شاعری اور مفلسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس تر بتر چاندنی میں شاعر رومان اختر شیرانی کا جام
بادہ گلگوں سے خالی ہے۔ شراب نہیں تو چاندنی بھی پھیکی معموم ہوتی ہے۔

نہیں شراب تو پھیکی ہے چاندنی کیسی — یہ سیل نور غضب ہے شراب نہ ہو سکا

☆☆

اثر صہبائی صاحب شباب کی دولت کھو چکے ہیں۔ وہ امنگیں، وہ جوانی، وہ غزلخوانی
باقی نہیں رہی۔ پیری نے رگ و پے میں افسردہ خون دوڑا دیا ہے۔ چاندنی اداس اور پھیکی پھیکی

نظر آ رہی ہے۔

پھیکی پھیکی ہیں چاندنی راہیں — اب کہاں وہ شباب کی چاہیں

☆☆

شاعری شخصیت کا عکس ہوتی ہے جس قدر کسی کی شخصیت منفرد ہوگی۔ اس کا محبوب بھی عام سطح سے بلند نظر آئے گا۔ ڈاکٹر تاثیر سے کون واقف نہیں۔ شاعر مشرق کا صحبت یافتہ۔ دیکھئے ان کے محبوب کے در پر چاند کس انفرادیت سے حلقہ زن ہے۔

حلقہ زن چاند ہے ترے در پر — راہگذر میں تری ستارے ہیں

☆☆

لاہور کی خوبصورت سر بفلک عمارات پر اگر آپ نے کبھی چاند کو جگمگاتے نہیں دیکھا تو آیئے آ کر عابد لاہوری کی آنکھوں سے دیکھئے۔

ہنس رہا ہے فلک پہ ماہ مبیں — چاندنی کی پری ہے رات نہیں

سید عبدالحمید عدم بھی لال پری کی محفل سے اٹھ کر چاند کی پری کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ لیکن یکا یک انہیں کسی گزشتہ شب ماہ کی یاد تڑپاتی ہے۔

اب تک ہے یاد وہ شب مہتاب ہمنشیں — جو بن کے رہ گئی ہے بس اک خواب ہمنشیں

☆☆

اب ہم آپ کا تعارف ملک عطا اللہ صاحب کلیم سے کرانا چاہتے ہیں۔ جب ان کا جی ہجوم افکار سے گھبرا اٹھتا ہے تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے یوں گویا ہوتے ہیں۔

آؤ ہم پھر اس سراپا نور کی باتیں کریں — چاندنی سے ہم سخن ہوں طور کی باتیں کریں

☆☆

اس نئی صبح میں نئے افق پر یوسف ظفر پھر ایک بار ایک طوفان برہم کی طرح انگڑائی لیتے ہوئے

نظر آتے ہیں پرانی قدروں کے محلات میں زلزلے محسوس ہونے لگتے ہیں اور ان کے کھنڈروں پر ایک نیا قصر تعمیر ہو رہا ہے۔

چاند کو دیکھ کر ہے نغمہ سیماب رواں — اور تارے کسی پازیب کے مارے لرزاں

☆☆

جدید شاعری کے علمبرداروں میں جوش صف اول میں دکھائی دیتے ہیں جوش صاحب ساغر و مینا میں عجب شان سے جلوہ گر ہیں جوش کی کائنات کی ہر شے وارفتگی و کیف و نظارہ سے معمور ہے۔ یہ لاابالی رند چاندنی کی بہار عارض رنگین پر دیکھتا ہے۔

غضب ہے عارض رنگین پہ چاندنی کی بہار — لبوں پہ کھیل رہا ہے تبسم لب ماہ!

جوش تصویر کشی کے وقت چند ایسے مخصوص پہلو چن لیتے ہیں کہ تصویر اپنی جزئیات اور ماحول کے مبہم نقوش تک لیے ہوئے سامنے آ جاتی ہے

آپ بھی آئیں کہ ہے دیر سے گرم تگ و دو — لرزش بادہ دیرینہ و عکس مہ نو
کروٹیں روح میں جس طور سے لے یاد حبیب — جام میں چاند کا یوں کانپ رہا ہے پرتو
سینہ شب میں تصور ہے سحر کا غلطاں — یا ہے جنگل کی گھنی چھاؤں میں مہتاب کی ضو

مہتاب کی ضو میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ قدیر چاند کے آئینہ میں محبوب سے نگاہیں ملا رہا ہے۔

میری نظروں کو تیری نظروں سے — بارہا چاند نے ملایا ہے

آیئے! اب اٹک پار چاندنی کی کارفرمائیاں ملاحظہ ہوں۔ یہاں کے شاعر رومان نذیر میرزا برلاس کو شکایت ہے۔

چاند کی کرنوں نے راتوں کو جگایا ہے مجھے — اور ستاروں نے اشاروں سے بلایا ہے مجھے
چاند تاروں نے جوانی میں ستایا ہے مجھے — چاند تاروں سے بہت دور نکل آیا ہوں
چاند تاروں سے بہت دور ہے منزل میری

فارغ بخاری کے ہاں اہتمام ہے ٹیلین شان سے۔

کیونکر پیش نہ دیکھ کر اس اہتمام کو　　کرنیں نچوڑ کر کوئی بھرتا ہے جام کو

رضا ہمدانی صاحب بھی اہتمام میں فارغ صاحب کے برابر کے شریک ہیں۔

اے رضا ان کو پلانے کے لیے　　چاند کا ساغر بنانا چاہیے

چاندنی رات میں مظہر بھی دشمن کی خوشامدیں دوست کی خاطر گوارا کرتے ہیں۔

تیرے روگ نے تو دشمن کی خوشامدیں سکھا دیں　　تیری بات پوچھتا ہوں شب ماہ آسماں سے

ضیائے مجسم حضرت ضیاء جعفری حافظ اور خیام کی تابانیوں کے ساتھ اس طرح ضیاء بار ہوتے ہیں۔

ہے جام بکف ماہِ تمام اے ساقی!　　ایسے میں پلا دے کوئی جام اے ساقی!

مے اب بھی ہے زاہد کی نگاہوں میں حرام　　پیتا ہوں میں لے کر ترا نام اے ساقی!

آخر میں قمر کو بھی کہنا پڑتا ہے

دل ربا سینے میں جب تک وہ قمر دل میں رہا　　اس کے جلوؤں سے کبھی خالی قمر منزل نہ تھی

☆

یہ شاعر تھے　اور اب سننے والوں کی پکاریں۔ مہ پاروں کے نغمے،،، نغمے اور گیت
۔۔ایک گیتوں بھری کہانی۔۔ مہ پارے　سید فارغ بخاری پیش کریں گے

فارغ بخاری اپنی گیتوں بھری کہانی مہ پارے سناتے ہیں

یہ گیتوں بھرا افسانہ تھا اب سنئے ایک اور گیت یہ گیت سازوں کا ساتھی نہیں اسے دل کی دھڑکن کے ساز پر سنئے یہ چاند کا عکس ہے ،"عکسِ ماہتاب" اور عکاس ہیں رضا ہمدانی

عکس ماہتاب

چاند پھیکیں کرنوں کے سفید لبادے بکھیرتا ہوا　زمردی آسمان کے حجرے سے نکلا...... دریا دل چاند کی فیاضی امرا کے محلوں تک محدود نہیں، غریبوں کے جھونپڑوں پر بھی چاندی کے پتر سے چڑھ گئے...... خیبر کے کہسار...... تاریخ عالم کی بے پایاں وادی کا سنگ میل............ وہ سنگ میل جس نے کئی غزنویوں کو منزل کی طرف اشارے کر کے اذن خرام دیا............ خیبر کے فولادی کہساروں کے لانبے لانبے سائے............ چاندنی رات............ اور کسی مدہوش عاشق کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز............ فرقت کے سوز میں رچے ہوئے "ٹپے" ۱............ اور .... وصال کی امنگوں سے بھرے ہوئے "لوبھے" ۲............ کہستانی موسیقی کے روپ میں ان تاریخی دروں میں بکھیر رہی ہے............

چاند نکل آیا ہے............ لیکن تم ابھی تک نہیں آئی!

یہ تاخیر مجھے شک بر کر رہی ہے............ میرے کسی "تربور" ۳ ۔ نے تمہارا راستہ تو نہیں روک لیا ہے............"

شاید، تم چاند چھپنے کے بعد آنا چاہتی ہو؟............ اور اس طرح تمہیں اپنے حسن اور چاند کا مقابلہ مقصود ہو!

تمہارا خیال صحیح ہے............ چاند بچارا تمہارے حسین چہرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا............

دراصل چاند میرے خوبصورت "نور مخے" ۴۔ کا عکس ہے............

☆

۱، ۲ پشتو شاعری کی اصناف (لوک گیت)

۳ چچازاد بھائی (عموماً دشمن کے لیے استعمال ہوتا ہے)

۴ روشن چہرے والی (پٹھان عورت کا نام)

☆

ادب لطیف کا یہ ٹکڑا ایک ادیب کے احساسات اور ماحول کی ترجمانی آپ نے

ملاحظہ فرمائی اب ہم ''بزم مہتاب'' منعقد کرتے ہیں اب ہم ہر ایک دل کو ٹٹولیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ اس دل میں چاند کے لیے کتنی محبت، عقیدت یا نفرت موجود ہے مشاعرہ بزم مشاعرہ سید فارغ بخاری تشریف لاتے ہیں

مہ پارے

چاندنی رات اور تنہائی   کس قدر تلخ ہے مرا احساس
کس نے خاموش ساز چھیڑ دیا   سارا ماحول ہے اداس اداس

☆

چاند کا رقص تیری آنکھوں میں   کس قدر کیف فزا ہوتا ہے
تو جو ہنستی ہے تو اے صبح حیات   شامِ فرقت کا خدا روتا ہے

سید مظہر گیلانی

چاندنی کی چھاؤں میں

چاندنی رات کی روح فزا چھاؤں میں
ایک سوئی ہوئی نوخیز بھکارن کا جمال
یوں ضیا بار کہ شاید ہے اسی نور سے چاند
یوں پُر انوار کہ جیسے ہو سحر کی دیوی
سر ادھر۔ پاؤں اُدھر، ہاتھ ادھر ہاتھ اُدھر
بے خبر

ننھے ننھے سے پھڑکتے ہوئے روشن نتھنے
اور سینے کا اُبھار
جیسے ندی کی حسیں سطح پہ روشن دو چاند
نشہء خواب میں مدہوش پڑی ہے بالکل
اور کچھ دور اندھیرے میں درختوں کے تلے
ایک بدمست جواں ہاتھ میں بوتل تھامے
اس ارادے سے کہ
سرمایہء غربت لوٹوں
چند پیسوں کے عوض
چاند ابھی دیکھ رہا تھا کہ بیک جست وہاں
بازوئے ثروت و سرمایہ پر
گیسوئے غربت و افلاس پریشان ہوئے

☆

مجید شاہد

غزل

چاند زمیں کی سمت ازل سے ہے نگراں   دنیا والو روپ کہاں بہروپ کہاں
آپ ہے اپنی کھوئی ہوئی منزل کا نشاں   بے سروساماں قافلہء آشفتہ سراں
خاک کے ذروں میں ہے کشش موجود   ورنہ خلاؤں میں ہی بھٹک جائیں انساں
دھیان کا یہ گہرا یخ بستہ سناٹا   بول اٹھتا ہے ہر منظر ہر نقش یہاں

محسن احسان

تصنع

چاند کیا ہے کوئی حسیں بیوہ — مرمریں جسم کو چھپائے ہوئے
منتظر ہے کسی کو دیکھتی ہے — دور تک چاندنی بچھائے ہوئے

آسماں کیا ہے سرمئی آنچل — جس میں لپٹا ہوا ہے چاند کا جسم
نکھری نکھری سی چاندنی کیا ہے — عکسِ خورشید ، ساحری یا طلسم

اور ہم لوگ کیا ہیں کچھ آنسو — مل کے موجِ نظر سے کھیلیں گے
یعنی شام وسحر کے زندانی — آج شام وسحر سے کھیلیں گے

حسن تخئیل کا سہارا لئے — ہر نظر شاہکار لائے گی
تشنگی بے خودی کے شیشے میں — آج خود کو اتار لائے گی

اور کل رات پھر وہی عالم — زلف ادبار، کوئی پیچ نہ خم
چاندنی رات کل بھی ہوگی مگر — ہر نظر ہوگی آج کا ماتم

جشنِ ماہتاب کیا تصنع ہے — کل جو کہنا ہے آج ہی کہہ لیں
آنسوؤں کو نہ روکنا محسن — کل جو بہنے ہیں آج ہی بہہ لیں
"جشنِ مہتاب" تیرگی کے حضور — ہے یہاں تشنگی کا نام سرور

کرن کرن میں تڑپتے ہیں طور کے جلوے — حسین خواب، جواں دل تلاش کرتے ہیں
کلی کلی کی جبیں پر ہے انگبیں کی نمی — ستارے شوخ بہاروں میں رنگ بھرتے ہیں

مگر یہ کیا کہ ابھی تک مری نگاہوں پر — سیاہ راتوں کی تاریکیاں برستی ہیں
یہ مست مست ضیائیں یہ نرم رو کرنیں — دلِ فسردہ کو اک آگ بن کے ڈستے ہیں

بجھی بجھی ہے تمنا، اداس اداس خیال — حیات میں کوئی طوفاں مچل نہیں سکتا
ہزار چاہوں مگر چند تلخیوں کے طفیل — کسی طرح سے بھی اُف جی بہل نہیں سکتا

یہ چاندنی، یہ ستارے، یہ نقرئی نغمے — مرے ندیم مجھے کب یہ راس آئے ہیں
میں جانتا ہوں ازل سے مرے مقدر پر — سنہرے حرف نہیں ظلمتوں کے سائے ہیں

فرید عرش

قہقہے

مسکراتی چاندنی کی اوٹ میں — وہ گھنی پلکوں کو جھپکانے لگے
کیف میں ڈوبے ہوئے ماحول کو — کچھ سہانے خواب سے آنے لگے
گونج اٹھیں چاروں طرف شہنائیاں — ایک مستی سی فضا پر چھا گئی
رچ گئی کن شوخ ہاتھوں میں حنا — چاند کے چہرے پہ سرخی آ گئی
اے متاعِ شامِ غم! اے ماہتاب — تو نے دیکھے ہیں ہزاروں زیر و بم
خونِ انسانی کا یہ پیچاک دیکھ — کھل رہا ہے آدمیت کا

شوکت واسطی

امکانات

تو نے جو پکارا ہے مجھے خواب میں آ کر

انگڑائیاں لے لے کے بدلنے لگے حالات
ملبوس ہوئی ریشمی آنچل میں حسیں رات
لہرانے لگے حال میں گذرے ہوئے راز
ٹھہرا ہے سماں، ست ہوئی وقت کی پرواز
کچھ شک نہیں دھیمی سی یہ پرواز بھی رک جائے
پیشانیِ تقدیر مرے پاؤں پہ جھک جائے

تعبیر بھی کہہ دے شبِ مہتاب میں آ کر
تو نے جو پکارا ہے مجھے خواب میں آ کر

☆

احمد فراز

شب گزیدہ

یہ ماہتاب یہ سیلابِ رنگ ونور، یہ کیف فضا میں نقرئی تانوں کے دل مچلتے ہیں
روش روش پہ ہے تابندہ جگنوؤں کی دمک چمن چمن میں سنہرے چراغ جلتے ہیں

☆

احمد فراز

شب گزیدہ

یہ ماہتاب، یہ سیلابِ رنگ ونور، یہ کیف
فضا میں نقرئی تانوں کے دل مچلتے ہیں
روش روش پہ ہے تابندہ جگنوؤں کی دمک
چمن چمن میں سنہرے چراغ جلتے ہیں

☆

کرن کرن میں تڑپتے ہیں طور کے جلوے
حسین خواب، جواں دل تلاش کرتے ہیں
کلی کلی کی جبیں پر ہے انگبیں کی نمی
ستارے شوخ بہاروں میں رنگ بھرتے ہیں

☆

مگر یہ کیا کہ ابھی تک مری نگاہوں میں
سیاہ راتوں کی تاریکیاں برستی ہیں
یہ مست مست ضیائیں یہ نرم رو کرنیں
دلِ فسردہ کو اک آگ بن کے ڈستی ہیں

بجھی بجھی ہے تمنا، اداس اداس خیال
حیات میں کوئی طوفاں مچل نہیں سکتا
ہزار چاہوں مگر چند تلخیوں کے سوا
کسی طرح سے بھی یہ جی بہل نہیں سکتا

☆

یہ چاندنی، یہ ستارے، یہ نقرئی نغمے
مرے ندیم مجھے کب یہ راس [illegible]ے ہیں
میں جانتا ہوں ازل سے مرے مقدر پر
سنہرے حرف نہیں ظلمتوں کے سائے ہیں